مارچ ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر سر پرستی

امین احسن اصلاحی

مدیر مسؤل

اسرار احمد

جلد ۱۶ | مارچ ۱۹۶۹ء | عدد ۳

تذکرہ و تبصرہ ★ ملکی سیاست نئے دور میں ..... اسرار احمد - ۱
★ کچھ ادارۂ تحقیقات اسلامی،
اسلام آباد، کے بارے میں ..... ,, - ۱۱
افادات فراہی ★ قرآن حکیم کی تمثیلات ..... خالد مسعود - ۱۵
تدبر قرآن ☆ تفسیر سورۂ الانعام (۳) مولانا امین احسن اصلاحی - ۱۷
مقالات ★ باب وصف الکبیر (۲) ... (تحریر) حضرت حارث المجاسی رح
... (ترجمہ) پروفیسر یوسف سلیم چشتی - ۳۶
★ خلافت کے لئے قرشیت کی شرط مولانا امین احسن اصلاحی - ۴۱
☆ اسلامی تحقیق، اس کے معنی ڈاکٹر محمد رفیع الدین - ۵۵
مدعا و دائرۂ کار (۳) ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ
★ اسلام اور سائنس (۱) ... ,, ,, ,, - ۶۷
متفرقات ★ افکار و آراء ..... - ۷۶
★ خطوط و نکات ..... - ۷۹

یکے از مطبوعات

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 (فون 69522)

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

دارُالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

عُلومِ قرآنی کی عُمومی نشرواشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجّہات قرآنِ حکیم کی جانب مُنعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبت جاگزیں ہو ——— اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کم از کم تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشرواشاعت کیلئے وقف کر دیں۔

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

آج سے دو ماہ قبل، جنوری ۱۹۶۹ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں 'میثاق' کے دورِ جدید کے ڈھائی سال کے عرصے میں پہلی بار ملکی سیاسیات پر قلم اٹھایا گیا تھا۔ 'میثاق' کے تیرہ صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں پاکستان کی موجودہ سیاست کے رجحانات اور ان کے پشت پر کارفرما عوامل کا جو تجزیہ ہم نے اپنے فہم کے مطابق کیا تھا وہ قارئین 'میثاق' کے حلقے میں تو بالعموم پسند کیا ہی گیا، بعض دوسرے حلقوں کی جانب سے بھی اس کی تائید و تصویب ہوئی[1] اور عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ یہ صورت حال کی واقعی اور حقیقی عکاسی اور مسائل و معاملات کا صحیح و بے لاگ تجزیہ ہے ——— اس تحریر کی اشاعت کے بعد کے دو ماہ بلاشبہ پاکستانی سیاسیات کی اکیس سالہ تاریخ کا اہم ترین دور ہیں، جن میں عوامی تحریک ایک طوفان بن کر اٹھی اور ایسی معرکۃ الآرا تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی چھ ماہ قبل تک نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اس طوفان کے متعدد ریلے گذر جانے کے بعد جو صورت حال سامنے آئی ہے اور پاکستانی سیاست کی سٹیج پر جو تازہ نقشہ جما ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جس کی تصویر ہم نے دو ماہ قبل کی اس تحریر میں کھینچی تھی۔

ہم نے اپنے تجزیے کا خلاصہ، تحریر کے آخر میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

" الغرض ایک مدت طویل کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گذشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی، اس کے مدھم پڑتے ہی جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گذشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیر سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آجانے سے سیاست

---

[1] چنانچہ ہفت روزہ 'نصرت' نے جسے اس وقت مسٹر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکاری ترجمان کی حیثیت حاصل ہے اپنی اکیسویں اشاعت میں اس پوری تحریر کو نقل کیا۔

کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے، اس کا مختصر نقشہ یہ ہے :-

۱۔ جہاں تک حکومتِ وقت کا تعلق ہے وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکر شاہی کے بل پر قائم ہے۔ اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اوّل تو کوئی ہیں ہی نہیں۔ اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اتفاقی جڑوں (ADVENTITIOUS ROOTS) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً برگد) کی شاخوں سے اتر کر زمین میں پنجے گاڑ لیتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لئے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

۲۔ پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گذر چکا جب سیاست صرف اصحابِ دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نو دولتیے صنعت کاروں کا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ   جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا   تماشہ دکھا کر مداری گیا

۳۔ پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصرِ اربعہ حسبِ ذیل ہیں : ایک‌ طرف دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن درحقیقت ایک واحد ہیں اور کسی بھی وقت آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک کے مصداق باہم متحد ہو سکتے ہیں (کنونشن لیگ اور کونسل لیگ تو خالص ہم جنس ہیں ہی، عوامی لیگ میں البتہ لیگی الاصل عناصر کے ساتھ ساتھ بعض حقیقی عوامی عناصر بھی شامل ہیں۔ لیکن سیاست کی موجودہ تیز رفتاری کے پیشِ نظر ان کا جلد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا قطعی ہے)، دوسرے دائیں بازو کی مضبوط مذہبی جماعت ——— جماعت اسلامی ——— تیسرے بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ) ہی میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں اور ——— چوتھے بائیں بازو کی مذہبی جماعت ——— جمعیت علمائے اسلام

۴۔ پاکستان کی آئندہ سیاست کا اصل محور (AXIS) دائیں اور بائیں بازوؤں کے رجحانات کا تصادم ہو گا اور مختلف گروہ یا ان موجودہ بساطِ سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (ALIGNMENT) اسی محور کے گرد ہو گی۔"   (میثاق۔ جنوری ۱۹۶۹ء، صفحات ۱۱ - ۱۲)

گزشتہ دو ماہ کے دوران کی ساری کھینچ تان اور اکھیڑ پچھاڑ اور اتنی مختلف النوع پیش قدمیوں اور پسپائیوں کے بعد جو صورت حال واضح ہو کر سامنے آتی ہے اس کا اس قدر صحیح اور پیشگی اندازہ صرف اسی لئے ممکن ہو سکا کہ ہمارا مطالعہ خالصتاً معروضی تھا اور اس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ صورت واقعہ جیسی کچھ ہے ہم نے اسے بعینہٖ اسی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور بغیر کسی قطع و برید اور کتر بیونت کے جوں کا توں پیش کر دیا۔

ہماری گزشتہ ماہ کی پیش کردہ مندرجہ ذیل رائے بھی اگر ذہن میں تازہ کر لی جائے تو جو صورت حال اب درپیش ہے اس کی نقشہ کشی بھی مکمل ہو جائے گی اور اس کے بارے میں ہماری رائے بھی ایک بار پھر واضح ہو جائے گی:

> سب سے تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردعمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورت حال کو صرف "بعض شر پسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر بیٹھتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہر حال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانش مندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس طرح اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں ——— لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی ——— پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک" کی

سی کیفیت سے لیس گیر ہو جانا چاہیئے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہو گا ——— اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر، ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔"

(میثاق فروری ۶۹ء صفحات ۵-۶)

وقت کا یہ "اہم تقاضہ" ہونے کو پورا تو ہو گیا لیکن جو "موانع و مشکلات" اس کی راہ میں پیش آئی ہیں اور ان کے دوران پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گذرا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔

صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی۔ اے۔ سی کو بالکل اچانک آ لیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے انہوں نے ایک رخ پر چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر لیا۔ لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے اُدھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DE TAT) سے تعبیر کر رہے ہیں[1]

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لیگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی "عبوری قومی حکومت" وجود میں آئی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہو گی۔ اس عمل کی مخالفت و مزاحمت بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، بائیں بازو کے انتہا پسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان

---

[1] عین اس مرحلے پر جبکہ پاکستان اس "غیر فوجی انقلاب" سے گذر رہا ہے۔ مسٹر آدم ملک وزیر خارجہ انڈونیشیا جہاں کچھ عرصہ قبل ایک باقاعدہ فوجی انقلاب آیا تھا کا دورہ پاکستان اور حکومت پاکستان کی طرف سے ہمارے تو حکومت کے ساتھ تعلقات مزید بڑھانے کی خواہش کا اظہار بہت معنی خیز ہے !!

کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے لہذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (PASSIVE RESISTANCE) پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا بھاشانی چونکہ اپنی پشت پر ایک واقعی عوامی سیاسی قوت بھی رکھتے ہیں لہذا انہوں نے اس مفاہمت کو برسرمیدان للکارا۔ اور بالفعل یہ کوشش کی کہ اب جبکہ ڈی اے سی عوامی تحریک کو بریک لگا رہی ہے وہ خود اس کی قیادت سنبھال کر اپنے پیش نظر انقلاب کی داغ بیل ڈال دیں۔

—— اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں اس "انقلاب" کی ابتدا ہو گئی تھی۔ فروری ۶۹ء کی سترہ تاریخ سے اکیس تاریخ تک کے چند دن واقعۃً پاکستان کی تاریخ میں وہ تیسرا نازک موقع تھے جبکہ پاکستان کا وجود سخت خطرے سے دوچار تھا۔ اور اس کی سالمیت سخت مشکوک ہو گئی تھی۔

ہم نے گذشتہ ماہ ان صفحات میں برسبیل تذکرہ عرض کیا تھا کہ "ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا۔ لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور —— اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیا اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پورے عالم ارضی میں غلبہ اسلام کی خدائی اسکیم کی ایک کڑی ضرور ہے!" تحریک پاکستان کے اساسی محرکات اور پاکستان کے معجز نما قیام کے ضمن میں تو ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ مارچ تا مئی ۶۷ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں ظاہر کر چکے ہیں۔ رہے وہ دو اہم مواقع جن پر ہمارے نزدیک پاکستان کے وجود و بقا کا تحفظ بالکل معجزانہ طور پر ہوا تو ان میں سے پہلا موقع تو وہ تھا جب صدر ایوب نے، اس وقت جبکہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے بالکل تنہا مالک تھے، امریکی اثرات کے تحت "متحدہ دفاع" (JOINT DEFENCE) کی تجویز کی صورت میں گویا پاکستان کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و مشیت کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی عقل اس وقت ماری گئی اور انہوں نے کمال رعونت کے ساتھ صدر ایوب کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا[1] اور اس طرح خالصۃً معجزانہ طور پر پاکستان کا مستقل وجود برقرار

---

[1] یادش بخیر، بالکل اسی مقام سے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے 'چین نواز' دور کا آغاز بھی بالکل ناگزیر ضرورت کے طور پر ہوا تھا۔ راقم نے بارہا نجی گفتگوؤں میں اس صورت حال کو اس تشبیہ سے تعبیر کیا ہے کہ امریکہ کے زیر اثر صدر ایوب نے پنڈت نہرو اور بھارت کے سامنے رکوع تو کر لیا تھا لیکن پنڈت جی شاید اپنے ہندو مذہبی پس منظر کی بنا پر چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ سجدہ کریں جسے ایک مسلمان کا بیٹا گوارا نہ کر سکا چنانچہ بجائے سجدہ کرنے کے صدر ایوب اٹھے تن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد مسلسل نہ صرف بھارت بلکہ اس کے معنوی سرپرست امریکہ سے بھی دور ہوتے چلے گئے نتیجۃً پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا جھکاؤ چین کی جانب ہوتا چلا گیا!

رہ گیا[1] ——— دوسرا موقع ۶۵ء کی جنگ تھی جس میں پاکستان کا بچ جانا کسی دنیوی حساب کتاب سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پاکستان کا تحفظ و بقا مطلوب ہے!

ہمارے تجزیے میں ہر اعتبار سے ان دونوں مواقع ہی کے برابر نازک موقع سترہ تا اکیس فروری ۶۹ء کے چند دن تھے۔ اور ہمارے نزدیک اگر اس موقع پر صدر ایوب، وہ بھاری قیمت ادا نہ کرتے جو انہوں نے اوّلاً انتخابات میں حصّہ نہ لینے کا اعلان کرکے ادا کی جو ایک کھلے اعترافِ شکست کے مترادف تھا۔ اور پھر اگر تہ سازش کیس واپس لے کر ادا کی جو داخلی و بین الاقوامی دونوں حیثیتوں سے سخت ذلّت آمیز صورت تھی، تو واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی کے جاری کردہ "انقلاب" کو روکنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی! ———[2]

اور اس صورت میں پاکستان کے مشرقی و مغربی خطّوں کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو جاتے کہ پھر ان کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور عوامی جمہوریہ چین کی زیرِ سرپرستی مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال پر مشتمل ایک علیحدہ کمیونسٹ ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی۔[3]

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے پاکستان اور اہلِ پاکستان پر کہ صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس موقع پر بالکل گھٹنے ٹیک دینے کی سخت ذلّت آمیز کیفیت کو

---

[1] یاد رہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو ہی کی ایک چال حماقت کے نتیجے میں پاکستان اپنی موجودہ صورت میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا۔ ورنہ مسلم لیگ نے تو کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا۔ اور اگر کبھی یہ تین خطّوں پر مشتمل "مہا بھارت" ایک بار وجود میں آ جاتا تو پھر کسے معلوم کہ پھر کبھی علیحدگی ممکن ہو سکتی یا نہیں!

[2] مولانا بھاشانی کی سیاسی قوّت کا جو مظاہرہ اس موقع پر ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ شیخ مجیب الرحمان پیرول پر رہائی کی صورت میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہی نہیں بے تاب تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی کی سیاست نے پورے ملک کو تعطّل اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا کئے رکھا تا آنکہ صدر ایوب نے مذکورہ بالا بھاری قیمت ادا کرکے مولانا بھاشانی کو بے بس کر دیا!

[3] مغربی بنگال کے درمیانی زمانے کے انتخابات کے جو نتائج حال ہی میں سامنے آئے ہیں ان کے پیشِ نظر یہ خطرہ خیالی و وہمی نہیں ——— بالکل حقیقی تھا! ——!

گوارا کر لیا اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ کم از کم فوری طور پر ٹل گیا ——— !

ہم ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک نہ سیاسی جبر و استبداد کے خلاف عوام کی جد و جہد کوئی بری چیز ہے نہ ہی معاشی ظلم و استحصال کے خلاف عوامی تحریک چلانا کسی درجے میں کوئی غلط کام ہے۔ دونوں ہی مقاصد اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ بلکہ ہمیں ان لوگوں کی رائے میں بہت وزن معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائے بغیر سیاسی ڈھانچوں میں سطحی اور اوپری تبدیلیوں سے قطعاً کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور نام نہاد جمہوریت بھی اس صورت میں سرمایہ داروں کے گھر کی لونڈی بن کر رہ جائے گی ——— لیکن ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ یہ سارے معاملات معروف سیاسی اسلوب و طریق سے طے ہونے چاہئیں اور اس میں نہ تو لاقانونیت اور انارکی کا رنگ پیدا ہونا چاہیئے اور نہ ہی انقلابی طریقے اختیار کیے جانے چاہئیں۔

جو لوگ سیاست کے میدان میں ملک و ملت کی مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہوں انہیں چاہیئے کہ محنت و مشقت سے کام کرنے کی عادت ڈالیں۔ اور مستقل مزاجی اور عزم و استقلال کے ساتھ اپنے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت کریں اور اپنے اپنے پروگرام عوام کے سامنے پیش کریں اور اس طرح اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کریں ——— پھر اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کو مضبوط و محکم تنظیمی سلسلوں میں منسلک کریں۔ اور کھلی سیاسی جد و جہد کے ذریعے ملک کے اجتماعی نظام میں اپنی صوابدید کے مطابق تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں ——— محض ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی یا ذہنی مسائل و معاملات کو نعروں کی صورت میں اچھال کر عارضی شور و غوغا برپا کر دینے سے نہ صرف یہ کہ حاصل کچھ نہ ہوگا بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں کوئی ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اسی طرح انقلابی طریقوں کے اختیار کرنے میں بھی شدید خطرات مضمر ہیں اور بھلائی سے زیادہ برائی کا اندیشہ ہے۔ گویا کہ ان دونوں کی حیثیت ہمارے نزدیک وہی ہے جو قرآن مجید کی رُو سے شراب اور قمار کی یعنی اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۔

اسی اعتبار سے ہمارے لئے انگریز قوم کی تاریخ میں ایک بڑا اہم سبق ہے۔ اس قوم نے اپنے ملک میں "رائے عامہ" کے بروئے کار آنے کے راستوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ نتیجۃً دنیا میں جتنے انقلاب آئے ان کے بہترین ثمرات سے بھی یہ متمتع ہوتی رہی لیکن کبھی کوئی انقلابی تبدیلی بھی اس کے یہاں برپا نہیں ہوئی۔ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف 'انقلاب' فرانس کی سرزمین پر رونما ہوا۔ اور اس کے لئے فرانسیسی قوم کو بھاری

قیمت ادا کرنی پڑی۔ لیکن اس کے بہترین ثمرات سے انگلستان متمتع ہوا۔ چنانچہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی اعلیٰ ترین صورت وہاں قائم ہے اور لطف یہ ہے کہ علامتی بادشاہت بھی تا حال وہاں موجود ہے اور جاگیرداری نظام کے آثار کو بھی ابھی تک انہوں نے بالکلیہ ختم نہیں کیا۔ اسی طرح کمیونسٹ انقلاب کے لئے خون کی ندیاں دوسرے ممالک میں بہیں۔ لیکن فلاحی ریاست اور کفالت عامہ کی خوبصورت ترین صورت کو آزاد معیشت کے ساتھ خوبصورت ترین طریقے پر انگلستان نے تحقق کیا ——— اور یہ سب کچھ نہایت عمدہ تدریج کے ساتھ بالکل کھلی اور علیٰ سیاسی سرگرمی کے نتیجے کے طور پر ہوتا رہا۔

اسی قسم کا ایک تجربہ ہمارے ہمسایہ ملک میں ہو رہا ہے جہاں جملہ معاملات کو سیاست کے میدان میں طے کرنے کے دروازے کھلے ہیں۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی حتیٰ کہ چین کے حامی کمیونسٹوں پر بھی کوئی پابندی نہیں چنانچہ سیاست کے میدان میں اتار چڑھاؤ اور مد و جذر تو آتے رہتے ہیں۔ لیکن تا حال کسی 'انقلاب' سے بھارت کو دوچار ہونا نہیں پڑا۔

ہمارے یہاں بھی خیر اسی میں ہے کہ یہ بات بطور اصول موضوعہ تسلیم کر لی جائے کہ جملہ معاملات و مسائل کا حل معروف سیاسی و جمہوری طریقوں پر ہوگا۔ اور سب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے اختیار و اقتدار حاصل کرنے اور مسند حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی میدان کی پابندیوں کو حتی الامکان ختم کر دیا جائے اور جذبہ و فکر کے اثر و نفوذ کی تمام راہوں کو حتی الامکان سب کے لئے یکساں کھول دیا جائے۔ تاکہ کہیں کسی زیر زمین سرگرمی یا انقلابی طریق کار کی ضرورت کا احساس ہی پیدا نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھا لی جانی چاہیئے ——— یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جذبہ و فکر کی راہوں کو کبھی مسدود نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان کے ایک جانب بند باندھیں گے تو وہ دوسری جانب سے نکلیں گے۔ ہمارے حالیہ تجربے سے تو یہ بات بالکل ہی ثابت ہو گئی ہے کہ کسی فکر کو پابند و پابجولاں کرنا ممکن نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر ہمارے یہاں پابندی عاید رہی۔ لیکن کمیونسٹ انقلاب ہمارے نصف بہتر خطے کے عین دروازوں تک پہنچ گیا تھا ———! فکر کا مقابلہ جوابی فکر ہی سے کیا جا سکتا ہے اور معاملات و مسائل کا حل ان کا مردانہ وار مواجہہ (FACE) کرنے ہی سے ممکن ہے۔ مصنوعی پابندیوں اور فراری ذہنیت سے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا!

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ ملکی سیاست کے میدان میں مذہب کا نام نہایت احتیاط کے ساتھ اور بالکل ناگزیر حد تک ہی لیا جانا چاہیئے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا بالعموم مذہبی اعتبار سے جو حال ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے اور خود عوام کی ایک عظیم اکثریت میں بنیادی اخلاقی و روحانی اقدار جس سطح پر ہیں وہ بھی کسی

سے مخفی نہیں۔ تو جب مذہب اس وقت نہ ہمارے فکر میں سرایت کئے ہوئے ہے نہ جذبے میں تو آخر سیاست کے میدان میں اس کی کارفرمائی کیسے ہوگی؟ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین و مذہب کے اعتبار سے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں اور شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا فرق و تفاوت ہے؟ ——— بلکہ عجیب تر صورت یہ ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے داعی اعظم مولانا بھاشانی تو علمائے دیوبند کے صحبت یافتہ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ اور نظام اسلام پارٹی کے متعدد اہم کارکنوں کے ملی و قومی جذبہ و اخلاص کے معترف ہونے کے باوجود ذاتی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ وہ جمعے کی نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں! ——— مقصود کسی کی تنقیص نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب بالکل بنیاد سے تعمیر جدید کا محتاج ہے اور احیاءِ اسلام کی آرزو رکھنے والے لوگوں کو پہلے فکر کے میدان میں اسلامی انقلاب اور عوامی سطح پر اسلام کی مخصوص اخلاقی و روحانی اقدار کی ازسرِنو ترویج کا کٹھن اور صبر آزما کام کرنا ہوگا۔ موجودالوقت حالات میں سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور سیاسی و معاشی مسائل میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں پر کفر و الحاد کے فتوے چسپاں کرنا بالآخر خود دین و مذہب کے لئے مُضر ثابت ہوگا۔

سوچنا چاہیئے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی، جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی، انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ، مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے۔ جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبار سے مناسب تر کوئی صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے اسی طرح ان مسائل میں بھی اسلام میں حالات و ضروریات کے مطابق مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آرہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملت اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہوگیا تھا لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ

کوشش کی جاتی نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کر دی جائیں ——— !!

پاکستان میں بحالی جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر لیس قبل از مارشل لا کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آ سکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو 'ووٹ' کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ 'نوٹ' حاصل کرنے کا ایک کاغذی ساحق مل جائے۔ بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رَو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوش مند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی پہلی نشست اگرچہ کل نصف گھنٹے کی تھی اور اس کی نوعیت خالص رسمی ملاقات کی تھی تاہم اس سے آئندہ صورت حال کا پورا نقشہ سامنے آ گیا ہے۔ اور اگرچہ فی الحال شرکائے کانفرنس بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں چنانچہ کسی جانب سے "عبوری قومی حکومت" کا نام لیا جا رہا ہے اور کوئی صرف نئے انتخابات تک کے لئے "عارضی نگران ادارے" کا نام لے رہا ہے۔ کوئی ۵۶ء کے دستور کی کامل بحالی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی بالکل نئے سرے سے دستور سازی کا تقاضہ کر رہا ہے۔ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ تو پرانا ہی تھا۔ اب شیخ مجیب الرحمان صاحب مشرقی و مغربی خطوں کے مابین مساوات (PARITY) کے اصول کو بھی ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔ غرضیکہ وہ تمام مسائل از سر نو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں دستور سازی کے کام میں ابتداً تاخیر و تعویق ہوئی تھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پاکستان کی ان تمام دستوری پیچیدگیوں کے حل کی عملی صورت کیا ہوگی ——— تاہم یہ بات واضح ہے کہ کونشن، کونسل اور عوامی تینوں لیگوں ہی کے مابین کچھ لے اور دے کر اور کسر و انکسار کے اصول کے تحت کوئی معاہدہ ہو جائے گا اور ان ہی کے اتحاد و اتفاق سے کوئی مضبوط حکومت مرکز میں بن سکے گی ——— دوسری جانب یہ بھی بالکل واضح ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو کے اتحاد سے اصل اپوزیشن وجود میں آئے گی۔ اور مقابل کے اصل دھڑے یہی دو ہوں گے۔ باقی رہے ڈی اے سی کے دوسرے شرکاء تو ان میں سے بعض ادھر اور بعض ادھر ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان کا دولتانہ گروپ اور مشرقی پاکستان کے شش نکاتی عوامی لیگ کے انتہا پسند طبقات اپوزیشن کے جانب آئیں گے

اور مذہبی جماعتوں میں سے جمعیت علمائے اسلام بلا واسطہ یا بالواسطہ ان ہی کے پلڑے میں وزن ڈالے گی ——۔ دوسری طرف نظام اسلام اور جماعت اسلامی چاہے فوراً حکومت میں شرکت کو ترجیح دیں یا فی الحال باہر رہنے کو پسند کریں، بہرحال مذکورہ بالا اتحادِ ثلاثہ کو سہارا دیں گی ——!!

آئندہ کی سیاست کا عملی نقشہ یہ بنے، یا کوئی اور، ہماری دلی خواہش جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا صرف یہ ہے کہ سارے معاملات سیاست کے کھلے میدان میں معروف طریقے پر طے ہوں اور نہ تشدّد انارکی اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو نہ انقلابی طور طریقے اختیار کئے جائیں۔

خدا کرے کہ اب ملک کے دونوں خطوں میں حالات معمول پر آ جائیں۔ تعلیمی ادارے کھل جائیں اور زندگی کا عام کاروبار معمول کے مطابق جاری رہے اور طوفانی سیاست کی کوئی نئی لہر ملک کو اپنی گرفت میں نہ لے۔ اس لئے کہ اگر اب کوئی نئی لہر اٹھی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہوگا۔ صدر ایوب اور ان کی حکومت تو اب میدان سے ہٹ ہی گئے ہیں۔ اب اگر تصادم ہوا تو عوام کا عوام سے ہوگا اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو دونوں اپنی موجودہ شکست کو کھلے دل سے قبول کر کے معروف طریقے پر اپوزیشن کا کردار اختیار کر لیں۔ اور اپنی قوت کے مظاہرے اور کسی انقلابی اقدام کا خیال دل میں نہ آنے دیں —— بصورت دیگر پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں عوامی تصادم شدید ترین صورت میں ظاہر ہوگا۔ مشرق میں اصل مقابلہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمان کے مابین ہوگا اور مغرب میں مسٹر بھٹو اور جماعت اسلامی کے حامی حلیف ہیں۔ مغرب میں تو دھمکیوں اور جوابی دھمکیوں کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مشرق میں فی الحال خاموشی ہے لیکن یہ خاموشی کسی بہت بڑے ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے ——!!

اللہ تعالیٰ ہی اس نازک موقع پر پاکستان کی حفاظت فرمانے والا ہے!!

(۲)

آزادیٔ ھند کے بعد ابتداً عام خیال یہ تھا کہ بھارت میں کمیونسٹ انقلاب کے امکانات بہت روشن ہیں، جبکہ پاکستان میں اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں! لیکن گذشتہ چھ ماہ کے دوران رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی ہے کہ دراصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور آج کا پاکستان بھارت کے مقابلے میں کمیونزم اور سوشلزم سے زیادہ قریب ہے۔ سوچنا چاہئے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں۔

مذکورہ بالا عام خیال کی بنیاد اس مغالطے پر تھی کہ پاکستان میں مذہب ایک مؤثر قوت ہے اور وہ کمیونزم کے سیلاب کی راہ میں [illegible] ثابت ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ تھا اور حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ قومی حیثیت سے ہمارے اوپر بھی مذہب کا رنگ ایک ملمع سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر

غرض کیا مذہب نہ ہمارے فکر پر حاوی ہے اور نہ ہی اسے ہمارے اصل موثر طبقات کے جذبات میں کوئی حقیقی نفوذ حاصل ہے۔ خالص عوامی سطح پر جو جذباتی لگاؤ مذہب کے ساتھ ہے اس کی اجتماعیات میں کوئی فیصلہ کن اہمیت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کمیونزم کی متوقع روک تھام کرنے والا یہ دفاعی بند محض ہوائی و خیالی تھا اور اس کا بے حقیقت ہونا اب ثابت ہو چکا۔

اس اعتبار سے تو پاکستان اور بھارت تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ لیکن دو باتوں میں ان کے مابین بہت فرق و تفاوت تھا۔ ایک یہ کہ ہمارے یہاں فکر اور نظریے کے میدان میں ایک گھپلا اور الجھاؤ مسلسل جاری رہا اور قوم کے اصل مؤثر طبقات کی لادینیت کے ساتھ ایک سطحی اور عوامی مذہبیت مسلسل الجھتی رہی جبکہ بھارت خالص لادینیت کی راہ پر گامزن رہا اور اس میدان میں کوئی منافقت کی راہ اس نے اختیار نہ کی۔

اور دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ایک مہیب سیاسی خلا تھا۔ چنانچہ نہ کوئی مضبوط سیاسی جماعت موجود تھی نہ قابل اعتماد قومی قیادت ——— جبکہ بھارت میں ایک عظیم اور محکم سیاسی جماعت بھی موجود تھی اور ایک مضبوط اور معتمد علیہ قومی قیادت بھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری یہ "عریاں حقیقت نگاری" بہت سے لوگوں پر بڑی گراں گذرے گی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ صورت واقعہ جیسی کچھ ہمیں نظر آتی ہے ویسی ہی بیان کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے نظریاتی گھپلے اور سیاسی خلا ہی نے موجودہ صورت حال کو جنم دیا ہے اور حالات کے رخ میں کوئی تبدیلی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ایک طرف نظریے اور فکر کے میدان میں دوغلے پن کو ختم کر کے یکسوئی و یک رنگی اختیار کی جائے اور دوسری طرف سیاسی میدان کے خلا کو مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں اور کھلی اور بے روک ٹوک سیاسی سرگرمی کے ذریعے پر کیا جائے۔

دوسری بات کے ضمن میں تو ہم تفصیل کے ساتھ اوپر لکھ چکے ہیں، اب چند گذارشات پہلی بات کے ذیل میں عرض کرنی ہیں۔ خصوصاً اس امر کے پیش نظر کہ بعض حضرات نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ 'ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد کو ختم کر دیا جائے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان میں نظریے اور فکر کے میدان میں جو الجھاؤ موجود ہے اس کو جانب لادینیت نہیں بلکہ جانب دین و مذہب ہی سلجھانا ممکن ہے۔ اگر یہ بات مسلّم ہے کہ کسی ملک اور قوم کی اصل قوت اس کے عوام ہی ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام کا جذباتی تعلق بہرحال دین و مذہب ہی کے ساتھ ہے۔ لادینیت و لامذہبیت کے ساتھ نہیں۔ نتیجۃً قوم میں فکر و نظر کی یکسانی و یک رنگی پیدا کرنے کی صرف ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ قوم کے طبقۂ خواص کے اذہان بھی دین و مذہب کے رخ پر ڈھلیں اور ان کے قلوب بھی اسلام و ایمان کے نور سے منور ہوں۔

لیکن یہ کام جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے اور محض سیاسی میدان میں عوام کی مذہبیت کے سہارے دین و مذہب کے نعرے لگانے سے یہ کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے ایک عظیم علمی و تعلیمی تحریک کی جس کے ذریعے ایک طرف علم کو مومن بنایا جائے اور دوسری جانب آئندہ نسلوں کو مسلمان بنا کر اٹھایا جائے ——— اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جس پر ہمارے نزدیک اسلام کے مستقبل، دراحیائے دین اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ

کا دارو مدار بھی ہے اور پاکستان کے بقا و تحفظ کا انحصار بھی۔ لہٰذا ہم ان صفحات میں بھی اسی کی اہمیت بار بار اجاگر کرتے رہے ہیں۔ اور اپنی حقیر قوتوں اور صلاحیتوں اور محدود فرصت و مہلتِ عمر کا مصرف بھی ہم نے یہی قرار دیا ہے کہ خالص قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک علمی و فکری تحریک کا اجراء ہو اور اس کے لئے ابتدائی اقدام کے طور پر ایک قرآن اکیڈمی قائم کی جائے[1]

علم و فکر کے میدان میں انقلابی کام کی توقع حکومتوں سے بالعموم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حکومتیں عموماً موجود الوقت فکری و نظریاتی ماحول کی عکاسی ہی کر سکتی ہیں۔ رائج الوقت فکری دھاروں کو بدلنا عام طور پر افراد اور پرائیویٹ اداروں ہی کے کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے گذشتہ اکیس سالوں کے دوران جدید و قدیم کے امتزاج کی ضرورت کے احساس کے تحت جتنے ادارے حکومت کی زیرِ سرپرستی قائم ہوئے وہ دین سے زیادہ بے دینی کے رخ پر بہہ نکلے اور ان سے اکثر و بیشتر فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا جس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال "ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" کراچوی ثم اسلام آبادی ہے۔

اس ادارے کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ اوّلاً کراچی میں مرحوم لیاقت علی خاں کے دورِ حکومت میں مرحوم ظہیر الدین لال میاں کے پرزور اصرار پر قائم ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے متعدد حضرات اس کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے لیکن اس کے کام کا کوئی واضح نقشہ متعین نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد اس کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کے ہاتھ آئی اور ۱۹۶۲ء کے دستور میں اس کے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل الفاظ میں متعین ہوئے:

> "The function of the Institute shall be to undertake Islamic research and Instruction in Islam for the purpose of assisting in the reconstruction of muslim society on a truly Islamic basis."
>
> Constitution : Article no 207 (2)

لیکن افسوس کہ اس ادارے نے بجائے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے بالکل دور از کار اور لایعنی بحثوں کے دروازے کھول دیئے جن سے الجھنوں ہی میں اضافہ ہوا اور فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ نتیجۃً عوام میں اس ادارے کے خلاف غم اور غصّہ کے جذبات پیدا ہوئے جس کی انتہائی صورت پچھلے دنوں اس مطالبے کی شکل میں سامنے آئی کہ

---

[1] جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ راقم الحروف کا کتابچہ "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام!" ضرور ملاحظہ فرمائیں!

اس ادارے ہی کو بند کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ مطالبہ محض غصے اور جھنجلاہٹ کا مظہر ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ چونکہ پاکستان اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے حاصل کیا گیا تھا لیکن گذشتہ اکیس سال کے عرصے میں یہاں نہ صرف یہ کہ اسلام کی جانب کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی بلکہ الٹی لادینیت اور اباحت پسندی ہی کو ترقی ہوئی لہٰذا پاکستان کا وجود عبث ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیئے۔

ہمارے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس ادارے کو جس پر پاکستان کے غریب عوام کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور لاکھوں روپیہ ہر سال خرچ ہو رہا ہے صحیح اور اہل لوگوں کے سپرد کیا جائے اور اس سے بالفعل وہی مقصد حاصل کیا جائے جس کے لئے اسے قائم کیا گیا تھا۔

پاکستان میں آئندہ جو حکومت بھی بنے، اور جو لوگ بھی برسر اقتدار آئیں ان سے ہماری مخلصانہ گذارش یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ پاکستان کی ترقی و استحکام ہی نہیں اس کا عین وجود بھی اسی ایک امر پر منحصر ہے کہ آیا اسلام یہاں خواص و عوام دونوں کے اذہان و قلوب میں راسخ بس کر پوری قوم میں فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک رنگی پیدا کرتا ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے جلد اس سوال کا مثبت جواب عملاً پیش نہ کیا تو جو صورت حال سامنے ہے اس کے پیش نظر دنیا کی اس عظیم ترین مسلمان مملکت کا چھوٹی چھوٹی علاقائی و لسانی قومیتوں میں بٹ کر منتشر ہونا اور پھر انہی بنیادوں پر آس پاس کی بڑی قومیتوں میں ضم ہو جانا یقینی ہے ——— اور یہ کام محض تقریروں اور بیانوں میں اسلام کی تعریف و توصیف سے نہیں ہوگا بلکہ صرف اس طرح ہوگا کہ ایک طرف علوم کو مسلمان بنایا جائے اور ایمان باللہ ہی کی بنیاد پر تمام طبعی، عمرانی اور نفسیاتی علوم کی تدوین جدید ہو اور دوسری طرف نظام تعلیم کے پورے ڈھانچے کو از سر نو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے ——— ان دونوں کاموں میں بھی مقدم چونکہ بہرحال علوم کی تدوین جدید ہی ہے اور اس ضمن میں اسلامی ریسرچ کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے نہایت وقیع خدمت سرانجام دے سکتے ہیں، لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ یہ ادارے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیئے جائیں جو جدید و قدیم دونوں علوم پر حاوی بھی ہوں اور ذہناً مسلم اور قلباً مومن بھی ہوں اور اسلامی ریسرچ کے کام کو صحیح خطوط پر آگے بڑھا سکیں۔ خدا کرے کہ یہ اہم ترین کام جو ہمارے یہاں اب تک نظر انداز ہوتا آیا ہے۔ اب مزید مؤخر نہ ہو!

اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک حقیری کوشش کے طور پر ہی ہم نے "تحقیق اسلامی: اس کے معنی و مقصد و دائرہ کار" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ بالاقساط "میثاق" میں شائع کیا اور انشاء اللہ بہت جلد اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کر دیں گے۔ ہمارے نزدیک یہ مقالہ اپنے موضوع پر قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ قوم کا ہر صاحب بصیرت شخص جو ذہناً و قلباً مومن و مسلم ہو۔ اس کے مندرجات کو اپنے دل کی آواز محسوس کرے گا!

افادات فراہیؒ
خالد مسعود

قرآن کی تمثیلات

تمثیل حقیقت میں تشبیہ کی ایک قسم ہوتی ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ تفہیم کی غرض سے ہوتی ہے اور اس اعتبار سے یہ حکمت کی ایک خاص قسم ہے۔ تمثیل میں ایک شے کو کسی ایسی شے کی صورت میں ذہن کے سامنے لایا جاتا ہے جو اس سے مماثلت رکھتی ہو اور دونوں کا حکم مشترک ہو۔ لیکن دوسری شے میں یہ حکم زیادہ واضح ہونا ضروری ہے۔ تمثیل کا مقصد اس حکم کو واضح کرنا ہوتا ہے جو یہ پہلی شے کے لئے دیتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ بات کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا جائے گا یا حقیقت کے مطابق اس پر غور کئے بغیر اس کے بارے میں باطل فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ تمثیل ایک شے کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اس کی تصویر کشی کرتی ہے۔ حق کی طرف رہنمائی کرنے والوں کا تمثیل سے مقصود یہی ہوتا ہے۔ رہے باطل کی طرف رہنمائی کرنے والے تو وہ ایک شے کو اس کی حقیقت کے خلاف تصور میں لاتے ہیں۔ وہ کچھ ظاہری باتوں کو پکڑ لیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس سے وہ سامع کو گھپلے میں ڈال کر اپنی مرضی کے عمل پر اسے اکساتے ہیں۔ شعری تشبیہات عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

بہرحال تمثیل کے لئے چند باتیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں تصویر کشی واضح ہونی چاہیئے۔ دوسری یہ کہ مشبہ بہ کا حکم واضح ہو۔ تیسری یہ کہ مبنی بر حقیقت تمثیل میں مشبہ کا حکم فی نفسہٖ ثابت ہونا چاہیئے۔ چوتھی یہ کہ تمثیل کے بغیر بات کا حکم مخفی رہتا ہو۔ حکم کا ظاہر کرنا تمثیل کی اصل غایت ہوتی ہے۔ اس غایت کے بغیر تمثیل کلام میں لغو سمجھی جاتی ہے اور اگر اس کی غایت فاسد ہو تو یہ گمراہی ہے۔

اچھی تمثیل کی بعض خصوصیات

ایک چیز جو تمثیل کی بلاغت میں اضافہ کرتی ہے وہ مشبہ کی تفصیل ہے اور اس سے دو غرضیں وابستہ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر طویل ہونے سے تصویر سامع کے ذہن میں پختہ ہو جائے۔ دوسری یہ کہ تصویر کامل بنے تاکہ ذہن فوراً اس کے حکم تک رسائی حاصل کر لے۔ یہ رسائی مشبہ کے مشبہ بہ کی صفات کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر بھی ہو سکتی ہے اور اس کی شدت سے متصف ہونے کی بنیاد پر بھی۔

اس کے علاوہ تمثیل کے لئے ایک اور شرط بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مشبہ بہ کی مذکورہ تفاصیل مشبہ کی ان تفاصیل کے مطابق ہوں جو بیان نہیں کی گئیں۔ اس لحاظ سے تطبیق کے پہلو کا سمجھنا غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے اسی لئے ایک مطابقت رکھنے والی مفصل تمثیل میں نہ صرف یہ کہ ایک عاقل کا حصہ ایک عامی سے زیادہ ہوتا ہے بلکہ عاقل لوگوں کے مابین بھی ان کے سمجھنے میں فرق ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض لوگ مطابقت کو پوری طرح نہ سمجھنے کے باعث مطابقت کے کسی ایک ہی پہلو پر قناعت کر لیتے ہیں۔

تمثیل کی اعلیٰ اقسام میں مشبہ کے مخفی حالات پر تنبیہ فی الواقع مقصود بھی ہوتی ہے۔ اس کے لئے چونکہ فکر و تدبر کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس لئے ان کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں کے مابین تفاوت بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ مشکل تمثیل ہی میں نہیں بلکہ علم و حکمت کے تمام پوشیدہ خزانوں تک رسائی حاصل کرنے میں پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اپنے اندر حکمت اور تعلیم کے بے شمار پہلو رکھتی ہے۔ لوگ ان پر غور و فکر کر کے اپنے فہم و علم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ عقلیں درجہ بدرجہ ہوتی ہیں اس لئے خدا کی کتاب سے لوگوں کا فائدہ اٹھانا بھی ان کی عقل کے مطابق ہی ممکن ہے۔ بلکہ اگر غور و فکر کا طریقہ غلط ہو تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چونکہ تمثیلات کے سمجھنے میں اس غلطی کا امکان بہت زیادہ ہے اس لئے ایک فاسد العقل آدمی ان سے گمراہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا :-

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرہ ۲۶)

رہے کافر تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے اس تمثیل سے کیا چاہا؟ وہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔ البتہ گمراہ وہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہوتے ہیں۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تمثیلات میں غور و فکر کا صحیح طریقہ واضح کر دیا جائے۔ (جاری ہے)

جماعت اسلامی کے ماضی و حال کا تجزیہ
تحریک جماعت اسلامی
ایک تحقیقی مطالعہ
تالیف : ڈاکٹر اسرار احمد
سائز ۲۲×۱۸/۸
صفحات ۲۳۶
طباعت آفسٹ
مجلد مع ڈسٹ کور
قیمت ۴.۰۰ روپے
(محصول ڈاک علاوہ)
ہم سے طلب فرمائیے : دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ اسلام پورہ لاہور

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۃ الانعام

۶ آگے کا مضمون - آیات ۵۱-۵۵

فرمایا کہ جو لوگ نشانیوں اور عذاب کے طالب اور منتظر ہیں، ان کو تو تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ان کے حال پر چھوڑ دو، البتہ جن لوگوں کے اندر خوف خدا اور فکر آخرت ہے ان کو اسی کتاب کے ذریعہ سے ڈراؤ جو تم پر وحی کی جا رہی ہے۔

پھر فرمایا کہ تمہاری شفقت و تربیت اور تمہاری توجہ و عنایت کے اصلی مستحق تو یہ غربائے مسلمین ہیں جو خدا کی رضا کے طالب ہیں اور جن کو دین کی طلب نے تمہارے اردگرد جمع کر دیا ہے۔ رہے یہ مغرور و متمرد لوگ جو تم سے نشانیاں اور معجزے مانگتے اور اکڑتے پھر رہے ہیں تو تم نہ ان کی پروا کرو، نہ ان کے پیچھے اصلی حقداروں کے حقوق میں غفلت کرو اور نہ ان کے کہنے پر تم غریب مسلمانوں کو اپنے سے دور کرو۔ یہ لوگ اس بات میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ ان غریبوں کے پہلو بہ پہلو تمہاری مجلس میں بیٹھیں یا تمہاری بات سنیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اگر تم ان کو اپنے سے قریب کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو جو ان کے ہم سر نہیں ہیں اور جن کے پاس آنے میں ان کی سبکی ہے۔ تم ان کی اس رعونت کی ذرا حوصلہ افزائی نہ کرو۔ اگر وہ اپنے اس غرور کے سبب سے ایمان سے محروم رہتے ہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ اس کی پرسش خدا کے ہاں تم سے نہیں ہونی ہے۔ اسی طرح جو مسئولیت تم پر ہے اس کا کوئی حصہ قیامت کے دن یہ اٹھانے والے نہیں بنیں گے کہ ان کے مطالبہ پر تم اہل ایمان کو اپنے سے دور کر کے اپنے سر ایک ظلم عظیم کی ذمہ داری لو۔

پھر فرمایا کہ ان مغروروں کے لیے ان کا مال و جاہ اور ان کا حسب و نسب ایک حجاب بن گیا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جب دنیا کی ساری سرفرازیاں ہمارا حصہ ہیں تو اگر یہ نیا دین اپنے اندر کوئی خیر کا پہلو رکھتا ہے تو کیا اس کے لیے

خدا کو یہی لوگ ملے جن کو دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو صحیح سالم کپڑے بھی نصیب نہیں۔ ان ظالموں کو یہ پتہ نہیں کہ اس دنیا کے خزف ریزے تو خدا اہلوں اور نااہلوں دونوں ہی کو دے دیتا ہے لیکن دین کی دولت گراں مایہ صرف انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ان غربائے مسلمین کی دلداری فرمائی تاکہ ان مغروروں کے اس طعن سے اگر ان کی کچھ دل شکستگی ہوئی ہو تو اس کا ازالہ ہو جائے۔ اس دلداری کے لئے خود خدائے رب العزت کی طرف سے جو سلام و پیام ان غریبوں کے نام آیا ہے اس کا ایک ایک حرف اپنے اندر زندگی جاوید کی خوش خبری اور خواجگی کون و مکان کی سرفرازی رکھتا ہے — اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ
لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۵۱ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ
يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ط مَا عَلَيْكَ
مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ
فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ۵۲ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم
بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ
بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ۵۳ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ
مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۵۴ وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ
الْمُجْرِمِينَ ۵۵۔

اور تم اسی کے ذریعہ سے خبردار کرو ان لوگوں کو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کئے جائیں گے اس حال میں کہ اس کے سامنے نہ ان کا کوئی حامی ہو گا نہ شفیع، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ۵۱

اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ اُن کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ اُن پر ہے کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ۔ اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ

نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چنا؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں؟ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اللہ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ اہل ایمان کی روش بھی واضح ہو جائے اور مجرموں کا رویہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ ۵۲-۵۵

۷۔ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۵۱

اوپر کے پیرے میں یہ اعلان پیغمبرؐ کی زبان سے کرا دیا گیا کہ نہ میں خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب جانتا ہوں، نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جو کسی نشانیٔ عذاب کے منتظر ہیں ان کو تو ان کے حال پر چھوڑو، البتہ جو عقل و فکر سے کام لینے والے ہیں اور جو اپنے دلوں کے اندر یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ ایک دن بہرحال خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اس طرح حاضر ہونا ہے کہ ان کا کوئی حامی و شفیع ایسا نہ ہوگا جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے، ان کو اس کتاب کے ذریعہ سے جو تم پر وحی کی جا رہی ہے خبردار و خبردار کرو۔ جن لوگوں کے اندر یہ ڈر موجود ہوگا وہی اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہی تقویٰ اختیار کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کریں گے۔ جن کے اندر آخرت کا کوئی اندیشہ ہی نہیں یا جو شرکاء و شفعا بنائے بیٹھے ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو وہ ان کو خدا سے چھڑا لیں گے، وہ دنیا جہان کی نشانیاں دیکھ کر بھی اسی طرح ایمان سے محروم رہیں گے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ انذار کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع ان لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ جن کی فطری صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں ان کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خدا ترسی کے لئے سب بڑا حجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ۔

وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۵۲)

اوپر کی آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پیغمبرؐ کو کن لوگوں کے ساتھ مشغول ہونا چاہیئے اور کن لوگوں سے بے پروا ہو جانا چاہیئے۔ اب یہ اس بات کی مزید وضاحت ہو رہی ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اپنے غرور مال و جاہ میں مست ہیں، تمہیں اس بنیاد پر کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ تم خزانوں کے مالک نہیں، تمہارے ساتھیوں کو اس وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ بے نوا، غریب، مفلس اور عزت و جاہ سے محروم لوگ ہیں، ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرو اور ان کے ایمان کی فکر میں ان لوگوں کے حقوق میں غفلت نہ ہو جو اللہ کی آیات پر ایمان لائے ہیں اور صبح و شام اس کی عبادت و طاعت میں سرگرم ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قریش کے اکابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت کے جہاں وہ بہانے پیدا کرتے تھے جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہیں یہ دلیل بھی لاتے تھے کہ آپ کے ساتھی بالکل غربا اور عوام کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں، جن میں غلام اور لونڈیاں بھی شامل ہیں۔ اول تو یہ دین اگر اللہ کا دین ہوتا تو کیا اللہ اپنے دین کو (نعوذ باللہ) انہی اراذل و انفار کو منتخب کرتا اور اگر یہی لوگ اس کے حامل قرار پائے ہیں تو پھر کسی کے شرافت کے لیے کہاں گنجائش باقی رہی کہ ان کے اندر شامل ہو کر اپنی عزت خاک میں ملائے؟۔ ان کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو پانے کے لئے تم اپنوں کو کھونے کی غلطی نہ کرنا، کھوئی ہوئی آوارہ بھیڑوں کی جستجو میں اپنے اصلی گلہ سے غفلت نہ ہونے پائے۔ تم نے ان کو اللہ کی دعوت پہنچا دی اب اگر یہ اپنی گمراہی میں پڑے رہے تو اس کی پرسش خدا کے ہاں بہرحال تم سے نہیں ہوگی۔ اب مواخذہ انہی سے ہونا ہے۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اگر ان کے پیچھے تم نے ان اللہ کے بندوں سے بے پروائی کی تو کل کو تمہاری طرف سے جوابدہ وہ بننے والے نہیں ہیں کہ تم ان کی خاطر اپنے کو ظالموں میں شامل کرا لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ آپ سے یہ اندیشہ تھا کہ آپ اپنے ان ساتھیوں کو نظر انداز فرما دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے، بلکہ یہ سرداران قریش کے غرور پر ضرب لگائی گئی ہے لیکن بات ان کو مخاطب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے بھی کہی ہے تاکہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ ان کی بات اس قابل بھی نہیں ہے کہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے اس کا جواب دیا جائے۔ خطاب یہ ہے کہ یہ جو بکواس کرتے ہیں کرنے دو۔ اگر یہ چیز ان کے لیے اسلام کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ ہے تو وہ جس جہنم میں چاہیں گریں، تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، جو خدا کے طالب

بن کر تمہارے پاس آئے ہیں تم ان کو اپنے پاس سے کس طرح دھتکار سکتے ہو؟ تمہاری ذمہ داریاں تم پر ہیں۔ کل کو یہ تو تمہاری طرف سے ذمہ دار نہیں ہوں گے کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کے حقوق تلف کرو جو تمہاری توجہ اور شفقت کے اصل حقدار ہیں۔ یہاں 'طرد' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اپنے معنی کے اعتبار سے سخت ضرور ہے اس لئے کہ اس کے معنی کسی کو دھتکار دینے اور دفع کرنے کے ہیں لیکن یہ لفظ سرداران قریش کی ذہنیت سامنے رکھ کر استعمال ہوا ہے اس لئے کہ ان کی خواہش یہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں تب ہم بات کرنے کے روادار ہوں گے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار کا یہ پہلو بھی یہاں نگاہ میں رہے کہ وہ اپنی قوم کے ایمان کے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، نہایت حریص ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے اس باب میں ایک تمثیل بھی بیان فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب تم میں سے کسی کی کوئی بھیڑ کھو جاتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ندیوں، نالوں اور جنگلوں میں پریشان پھرتا ہے اور اپنے اصل گلہ کو بھول جاتا ہے۔ پھر جب وہ مل جاتی ہے تو اس کو اپنے کندھے پہ اٹھا کر لاتا ہے اور اپنے لوگوں میں آکر کہتا ہے، اے لوگو، میرے ساتھ خوشی مناؤ اس لئے کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مجھے مل گئی۔ یہ تمثیل جس طرح اللہ تعالےٰ کی اس رافت کو ظاہر کرتی ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے ان بندوں کے لیے رکھتا ہے جو گمراہی کے بعد ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی طرح حضرات انبیاءؑ کی اس بیقراری کو بھی ظاہر کرتی ہے جو ان کے اندر اپنی قوم کے گمراہوں کے ایمان اور ان کی اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔

حضرات انبیاءؑ کی اس صفت میں اللہ تعالےٰ کی صفت کا ایک عکس ہے اس وجہ سے یہ ایک محبوب اور پسندیدہ صفت ہے، لیکن یہ صفت بھی اپنے کچھ حدود و قیود رکھتی ہے۔ اللہ تعالےٰ یہ نہیں پسند فرماتا کہ پیغمبر کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں اتنا سرگرداں رہے کہ اپنے اصل گلے کی دیکھ بھال میں غفلت ہو جائے۔ جو سرکش اور آوارہ بھیڑ قابو میں نہیں آتی وہ کسی بھیڑیئے ہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح یہاں فرمایا کہ یہ مغرور لوگ اگر اپنی نازبرداری اس حد تک چاہتے ہیں کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو جو صبح شام رضائے الٰہی کی طلب میں سرگرم ہیں تو یہ کرنے کے تم مجاز نہیں ہو۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اس مضمون کو سورۂ عبس کی تفسیر میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور اس کے بعض نہایت اہم پہلو ہم بھی مناسب مواقع پر ظاہر کرتے جائیں گے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ
بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۔ ۵۳

'لِيَقُوْلُوْٓا' میں حرف 'ل' لام عاقبت ہے جو علت کو نہیں بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے ۔ یہ

اس دنیا میں امارت و غربت دونوں امتحان کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی کو دولت جو دی ہے تو اس بنا پر نہیں دی ہے کہ وہ اسی کا حقدار تھا۔ اسی طرح کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسی کا سزاوار تھا بلکہ ایک کو دولت اور دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان کیا ہے۔ وہ جن کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس لئے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پاکر اس کے شکر گزار، متواضع اور فرمانبردار بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو حقارت سے دیکھنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کیلئے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر، حاصل نعمتوں اور اپنی نانِ جویں پر قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر میں خوددار رہتے ہیں، یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے ہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی امتحان کی ہم نے ان کو ڈالا ہے۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تاکہ یہ ہمارے شکر گزار بندے بنیں لیکن ان کی کج فہمی کے باعث ہماری نعمت ان کے لئے فتنہ بن گئی۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی ساری نعمتوں کے پیدائشی حقدار اور ہر عزت و جاہ کے خاندانی اجارہ دار ہیں۔ نتیجہ اس کج فہمی کا یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی تو کیا اس سے سرفراز کرنے کے لیے خدا کو یہی اراذل و اجلاف اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے؟ آخر ہم اشراف و اعیان، سرداران قریش اور روسائے طائف کہاں مر گئے تھے کہ آسمان سے یہ نعمت اترتی تو ہمارا پتہ اس کو نہ مل سکا اور وہ ان پر جا کر نازل ہو گئی!! سرداران قریش کے اس غرور کا حوالہ قرآن نے بعض دوسرے مقامات میں بھی دیا ہے۔ مثلاً وقال الذین کفروا للذین اٰمنوا لو کان خیرا ما سبقونا الیہ ۱۱۔ احقاف (اور کافروں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر یہ دین کوئی خیر والی چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہیں لے جا سکتے تھے) دوسری جگہ ہے۔ ولا اقول للذین تزدری اعینکم لن یؤتیھم اللہ خیرا ۳۱۔ ھود (اور میں ان لوگوں کے بارے میں جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ خدا کبھی ان کو کوئی نعمت دے ہی نہیں سکتا) ایمان و اسلام تو درکنار نبوت کو بھی یہ لوگ اپنا اجارہ سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو نبی بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو بناتا، اس منصب کے لئے یہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو ملے تھے۔

دین کی نعمت کے اصل حقدار

قرآن نے ان کے اس تمرد کے جواب میں فرمایا کہ الیس اللہ باعلم بالشاکرین (کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو نہیں جانتا) مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار رہے، جنہوں نے خدا کی

نعمتوں کی قدر کی، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنہوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنہوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنہوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا ان کے لیے اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت صرف انہی کو ملتی ہے جو خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ
رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ۵۴

'سلام علیکم' جس طرح ملاقات اور رخصت کا کلمہ ہے اسی طرح خیر مقدم کا کلمہ بھی ہے۔ مثلاً فرشتے توحید پر ثابت قدم رہنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہیں گے سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون ۳۲۔ نحل (تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے صلے میں)

غربائے مسلمین کے خیر مقدم کی ہدایت

اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غربائے مسلمین کے ساتھ بالکل اس کے ضد طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی جس کا مطالبہ سرداران قریش کرتے تھے۔ سرداران قریش تو، جیسا کہ بیان ہوا، یہ چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ جب ہماری آیتوں پر ایمان لانے والے ہمارے یہ بندے تمہارے پاس آیا کریں تو تم سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا کرو اور ہماری طرف سے ان کو بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔ اگر تم میں سے کسی سے نادانی کے سبب سے کوئی غلطی صادر ہو جائیگی اور اس کے بعد وہ توبہ و اصلاح کرے گا تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اہل ایمان کی اصلی چاہت

یہاں اللہ تعالیٰ نے جو بشارت دی ہے وہ صرف رحمت و مغفرت کی ہے۔ اس کے ساتھ کسی دنیوی مال و جاہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے اللہ کے ان غریب، لیکن دنیا اور سرو سامان دنیا سے بے نیاز، بندوں کے باطن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ سرو سامان دنیا سے محروم ہونے کے باوجود اپنے دل میں اس دنیا کا کوئی ارمان نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دل کو اگر لگن تھی تو اس بات کی تھی کہ ان کو اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل ہو۔ اوپر ان کی صفت بھی یہی بیان ہوئی ہے۔ یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی یریدون وجھہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس باطنی آرزو کے لحاظ سے

ان کو اسی چیز کی بشارت دی جس کے وہ سب سے زیادہ طلب گار تھے۔ اس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلی کہ دنیا کے پرستار جن چیزوں پر مرتے ہیں، اللہ کے با ایمان بندوں کی نگاہوں میں ان کی قدر و قیمت بال نگس کے برابر بھی نہیں۔ نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۵۵

یہاں "ولتستبین" کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر پوری بات کھول دی جائے تو یوں ہوگی۔ وکذلک نفصل الآیات لتستبین سبیل المومنین و لتستبین سبیل المجرمین۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔ اوپر تفصیل سے بیان ہوا کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کی روش کیا ہوتی ہے اور جو ایمان لاتے ہیں ان کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ آخر میں یہ اشارہ فرما دیا کہ یہ ساری تفصیل ہم نے اسی لئے سنائی ہے کہ تم پر دونوں کی روش اور دونوں کا انداز فکر واضح ہو جائے تاکہ بلا سبب کوئی چیز وجہ پریشانی نہ بنے۔

۸۔ آگے کا مضمون آیات ۵۶ تا ۶۷

آگے وہی مضمون جو اوپر سے چلا آ رہا ہے نئے انداز اور نئے پہلوؤں سے بیان ہوا ہے۔ پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو اور اس شرک کی حمایت میں مجھ سے لڑتے ہو لیکن مجھے ان شریکوں کی عبادت سے میرے رب نے روک دیا ہے اس وجہ سے میرے لیے اس بات کا امکان نہیں ہے کہ میں تمہاری بدعتوں کی پیروی کر لوں۔ یہ بات کہ خدا نے مجھے اس سے روک دیا ہے، ایک واضح دلیل اور ایک قطعی حجت پر مبنی ہے۔ اس باب میں میرے رب کی شہادت اس وحی کی صورت میں موجود ہے جو مجھ پر آتی ہے لیکن تم اس وحی کو جھٹلاتے ہو اور اس وقت تک اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہو جب تک تم کو خدا کا عذاب نہ دکھا دیا جائے۔ یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ اگر یہ چیز میرے اختیار میں ہوتی تو اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا رب اس جھگڑے کا فیصلہ فرمائے گا اور نہایت خوبی کے ساتھ فرمائے گا لیکن کب اور کس طرح؟ اس کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جو اپنی اس کائنات کے تمام رازوں اور بھیدوں کا جاننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات کہ مرنے کے بعد ایک روز اٹھنا ہے اور اٹھنے کے بعد ایک ہی خدا کے آگے حاضر ہونا ہے پھر سب کو اپنے مولائے حقیقی کے آگے جواب دہی کرنی ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس کا

ریہرسل REHEARSAL اس دنیا کے سٹیج پر ہر روز ہو رہا ہے لیکن جو لوگ آنکھیں بند کئے ہوئے ہوں ان کا کیا علاج!

اس کے بعد انسان کی اس نفسیاتی بیماری کی طرف توجہ دلائی کہ یہ جب کسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تب تو خدا خدا پکارتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے لیکن اس آزمائش سے خدا جب اس کو نجات دے دیتا ہے تو چھوٹتے ہی اپنی پچھلی سرمستیوں اور حماقتوں میں پھر کھو جاتا ہے، گویا کوئی بات سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ خدا کے قابو سے بالکل باہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی بیماری میں یہ لوگ مبتلا ہیں جو آج عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ہر بات کے لئے خدا کے ہاں ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا تو دیکھ لو گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ۝۵۶ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝۵۷ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۵۸ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۵۹ وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۶۰ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ یُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝۶۱ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ۝۶۲ قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝۶۳ قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝۶۴ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ

شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۶۵ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۶۶ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۶۷

ترجمہ کہہ دو کہ مجھے تو ان کی عبادت سے روکا گیا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو میں تمہاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر راہ پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا۔ کہہ دو میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بر و بحر میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے۔ ۵۷ - ۵۹

اور وہی ہے جو تمہیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے، پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت معیّن پوری کی جائے۔ پھر اسی طرف تمہارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں باخبر کرے گا اس چیز سے جو تم کرتے رہے ہو۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ تم پر اپنے نگراں مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو ہمارے فرستادے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ سب اللہ، اپنے مولائے حقیقی، ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ آگاہ کہ فیصلہ کا سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب سے زیادہ تیز حساب چکانے والا ہے۔ ۶۰ - ۶۲

ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے؟ کہہ دو اللہ ہی تم

کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہہ دو، خدا قادر ہے اس بات پر کہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب اٹھا دے یا تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس ہی میں گتھم گتھا کر دے اور ایک کو دوسرے کے تشدد کا مزا اچھی طرح چکھا دے۔ دیکھو، کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ ۶۳-۶۵

اور تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ کہہ دو میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے۔ ۶۶-۶۷

۹- الفاظ کی تحقیق، آیات کی وضاحت

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ۔ ۵۶

لفظ 'قل' کا محل استعمال

لفظ 'قُل' اس آیت میں بھی ہے اور بعد کی آیات میں بھی بار بار آیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سب باتیں ان شبہات، اعتراضات، سوالات، اور مطالبات کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں جو اس وقت بحث کی گرماگرمی میں کفار کی طرف سے پیش کیے گئے۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن میں یہ وضاحت ہر جگہ موجود نہیں ہوتی کہ فلاں بات کفار کی کس بات کے جواب میں کہلائی گئی۔

اوپر آیت ۱۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ "مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور مشرکوں میں سے نہ بنوں"۔ اس کے بعد یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اس باب میں کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں سب سے بڑی شہادت تو خدا ہی کی ہو سکتی ہے اور خدا کی شہادت جو بشکل قرآن مجھ پر نازل ہوئی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس وجہ سے میں اس شہادت کے خلاف کسی کو اس کا شریک ٹھہرانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہاں اسی اعلان کو منفی پہلو سے دہرایا کہ تم جن چیزوں کو اللہ کے سوا پکارتے ہو مجھے ان کی بندگی سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں پکارنے سے مراد ظاہر ہے کہ وہ پکارنا ہے جو دعا اور استمداد کی نوعیت کا ہو۔ اس طرح اللہ کے سوا کسی کو پکارنا درحقیقت اس کی عبادت ہے اور یہ چیز شرک ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "تم اعلان کر دو کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا"

'خواہشوں' سے مراد مشرکانہ بدعات ہیں۔ ان کو 'اھوا' کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے ان کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا کے کلام و الہام میں، محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں گھڑی ہیں اور چونکہ ان کی موہوم شفاعت کی امید نے تمہیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ تمہارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہرحال تمہیں پسند ہیں تو ہوں لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمہاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔ فرمایا کہ اگر میں ایسا کروں تو میں راہ ہدایت سے بھٹک جاؤں گا اور پھر کبھی راہ ہدایت پانے والا نہ بن سکوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو شرک کی ضلالت ہے ہی ایسی ضلالت کہ آدمی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ایسی کج پیچ کی پگڈنڈیوں میں گم ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے اصل راہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے، دوسرے خدا کی صریح ممانعت کے بعد اگر میں نے یہ غلطی کی تو پھر کون ہے جس کی توفیق بخشی میرا سہارا بنے گی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صحیح راہ پر لائے گا؟

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ ۵۷ - ۵۸

'قل انی علی بینۃ من ربی و کذبتم بہ' 'بینۃ' سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالٰے نے اپنی طرف سے بطور شہادت اتارا ہے کہ اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ اس شہادت کا ذکر پیچھے آیت ۱۹ میں گزر چکا ہے۔ آگے آیت ۱۵۷ میں قرآن کے لئے یہی لفظ استعمال ہوا ہے او تقولوا لو انا انزل علینا الکتاب لکنا اھدی منھم فقد جاءکم بینۃ من ربکم و ھدی و رحمۃ (یا کہیں تم یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، سو دیکھو تو تمہارے پاس بھی تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح شہادت اور ہدایت و رحمت آگئی) 'و کذبتم بہ' میں ضمیر کا مرجع 'بینۃ' ہے لیکن لحاظ مفہوم کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے لحاظ سے استعمال ہوئی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ نے اپنی کتابوں میں اس اسلوب پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مناسب مواقع پر ہم اس کی بلاغت پر بحث

کریں گے۔ یہاں قرآن کے لئے 'بیّنۃ' کا لفظ استعمال کر کے اس کا ایک حجت قاطع اور شہادت واضح ہونا ظاہر کر دیا ہے پھر ضمیر اس کے لیے مذکر کی استعمال کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

قرآن ایک حجت قاطع ہے

مطلب آیت کا یہ ہے کہ تم تو محض ہوا میں تیر چلا رہے ہو اور اپنی خواہشوں کی پرستش کر رہے ہو، تمہارے پاس اپنے ان فرضی معبودوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اس کے برعکس میں خدا کی طرف سے ایک حجت، ایک برہان اور ایک قطعی شہادت پر ہوں اور اسی کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ خدا نے یہ 'بیّنۃ' خود مجھ پر اتاری ہے اور یہ ایسی واضح ہے کہ اس کی تکذیب کی گنجائش نہیں ہے لیکن تم اس کی تکذیب کرتے ہو اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھو اور مانو مجھ سے مطالبہ کرتے ہو کہ میں تمہیں خدا کا عذاب دکھا دوں تو تم اس کتاب کی صداقت تسلیم کرو گے۔ 'ما عندی ما تستعجلون بہ' سو یہ عذاب، جس کے لئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، میرے پاس نہیں ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ کرنا خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ حق کو واضح اور اس نزاع کا فیصلہ کرے گا اور نہایت بہتر طریقہ پر فیصلہ کرے گا۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے لئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو میرے اختیار میں ہوتی تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا۔

'واللہ اعلم بالظالمین' میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو ان کفار کے لئے دھمکی ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ دوسرا پہلو اس میں تعریض کا ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔ پس ان کا معاملہ اسی کے حوالے ہے۔ یہاں ظلم سے مراد اپنی جان پر ظلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ خدا ان کو اپنی رحمت دے رہا ہے لیکن یہ اس کے عذاب کے طالب ہیں۔ ان کو روٹی دی جا رہی ہے لیکن یہ پتھر مانگتے ہیں۔ ان کو مچھلی عنایت ہوئی ہے مگر یہ سانپ پکڑنے کے درپے ہیں۔

خدا کا علم محیط کل ہے

عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۵۹)

'مفاتح' 'مفتح' کی جمع ہے جس کے معنی کنجی کے ہیں۔ یعنی غیب کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا ان کا علم کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے لہ مقالید السموات والارض، یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر ۱۲۔ شوریٰ (اسی کے قبضہ میں ہیں

آسمانوں اور زمین کی کنجیاں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے) 'بر و بحر' اور 'رطب و یابس' وغیرہ الفاظ احاطہ کے مضمون کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ 'ظلمات الارض' سے مراد زمین کی تہیں اور اس کے طبقات ہیں۔

یہ اوپر والے مضمون کی مزید توسیع ہے۔ جب فرمایا کہ "میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کے لئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اس امر میں فیصلہ کا اختیار صرف خدا کو ہے" تو علم الٰہی کی وسعت اور اس کے احاطہ کے بیان کے لئے ایک نہایت موزوں تقریب پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی اس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بھی بنیاد ہے اور اسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآن کے اس بیان سے ان لوگوں کی بھی پوری پوری تردید ہو گئی جو خدا کو صرف کلیات کا عالم مانتے ہیں۔ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں بلکہ تمام جزئیات کا بھی عالم ہے۔ درخت سے جو پتا گرتا ہے، زمین کی تہوں میں جو دانہ ڈالا جاتا ہے، سب اس کے علم میں ہوتا ہے اور ہر خشک و تر اس کے رجسٹر میں درج ہے۔ اور یہ رجسٹر ایسا نہیں ہے جس میں اس کو کوئی چیز ڈھونڈنی پڑتی ہو بلکہ اس کی ہر چیز ہر آن بالکل واضح ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم کی ایک تعبیر ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۡ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝

علم الٰہی کے اس بیان نے موت کے بعد زندگی، اس زندگی کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا کی یاد دہانی کے لئے اس طرح تقریب پیدا کر دی گویا بات میں سے بات نکل آئی ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کے باب میں بڑا مغالطہ لوگوں کو علم الٰہی کے صحیح تصور کے فقدان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ کم فہم انسان سمجھتا ہے کہ اتنی بے شمار مخلوق کے مرنے اور جینے اور اس کے قول و فعل کے ایک ایک جزئیہ کا علم بھلا کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے، ان کو جمع کرے اور پھر ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ قرآن نے اسی استبعاد اور اسی مغالطہ کو یہاں دور فرمایا ہے۔

علم الٰہی اور توحید و آخرت کا باہمی ربط

پہلے فرمایا کہ وہی خدا جو درخت سے گرنے والے ہر پتے اور زمین میں دفن ہونے والے ہر دانے کو جانتا ہے تمہیں مرنے کے بعد پھر اٹھائے گا اور جو کچھ تم نے اس دنیا میں کیا ہو گا اس سے تمہیں آگاہ کرے گا۔ اس بات کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ یہ مرنا اور مرنے کے بعد از سر نو اٹھنا اور اپنے سارے کئے دھرے سے آگاہ کیا جانا کوئی بہت بعید از قیاس چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل ہر شب و روز تمہاری اپنی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر شب میں خدا تمہیں وفات دیتا ہے اور جب وفات دیتا ہے تو وہ سب کچھ اس کے علم میں ہوتا ہے جو دن میں تم نے کیا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے دن میں خدا تم کو اٹھاتا ہے اور اس طرح تمہاری وہ مدت حیات اور اجل معین پوری ہوتی ہے جو خدا نے تم میں سے ہر ایک کے لئے مقرر کی ہوئی ہے۔ گویا زندگی موت، برزخ اور موت کے بعد اٹھائے جانے کا تمثیلی مشاہدہ تم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جا رہا ہے۔ خدا نے یہ دنیا بنائی ہی اس طرح ہے کہ وہ اپنی رات اور دن کی گردشوں سے ان تمام حقائق کا درس دے رہی ہے جن کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے بشرطیکہ تمہارے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے دل ہوں۔ قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو 'وفات' سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو 'بعث' سے تعبیر کر کے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہو رہا ہے، جس طرح تمہارا سونا اور جاگنا ہے اسی طرح تمہارا مرنا اور اٹھنا ہے۔ اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا اسی طرح جب تم موت کی نیند سوؤ گے تو خدا تمہاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمہاری ہر شب کی نیند کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کرو گے کہ یہ جو کچھ ہوا سب صبح و شام کا قصہ ہے۔

'وھو القاھر فوق عبادہ الایۃ' لفظ 'قہر' کا مفہوم آیت ۱۸ اور 'تفریط' کا مفہوم آیت ۳۸ کے تحت، بیان ہو چکا ہے۔ 'حَفَظَۃ'، 'حافظ' کی جمع ہے جس کے معنی کسی شے کی نگرانی کے ذمہ دار کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں وہ خدائی پہرہ دار ہیں جو ہر جان پر خدا کی طرف سے برابر مقرر رہتے ہیں۔

ہر جان پر خدا کی نگرانی ہے

مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ خدا اپنی مخلوق کے کسی فرد اور اپنے گلے کی کسی بھیڑ سے کبھی غافل ہوتا ہے۔ سب ہر وقت اسی کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ برابر اپنے نگراں فرشتوں کو ان پر مقرر رکھتا ہے جو ایک پل کے لیے بھی ان کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔ پھر جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو فرمایا "ہمارے فرستادہ فرشتے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کوئی کوتاہی کریں"۔ نہ ان کے قابو سے کوئی باہر نکل سکتا، نہ کسی کو وہ فراموش کر سکتے، نہ کسی کی مدت ایک لمحہ کے لیے بھی آگے پیچھے ہو سکتی۔

'ثم ردوا الی اللہ مولٰھم الحق' پھر سب اللہ ہی کی طرف، جو سب کا مولائے حقیقی ہے، لوٹائے جائیں گے۔ یعنی مرنے کے بعد سابقہ ہر ایک کو خدا ہی سے پیش آنا ہے۔ اس لیے کہ مولائے حقیقی وہی ہے دوسرے شرکاء و شفعا جو لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں وہ کچھ کام نہیں آئیں گے۔ 'الا لہ الحکم' اور کان کھول کر سن لو کہ فیصلہ کا سارا اختیار تنہا اسی کے ہاتھ میں ہوگا، اس کے اذن کے بغیر کوئی اس کے سامنے زبان نہ کھول سکے گا۔ 'وھو اسرع الحاسبین' یعنی یہ نہ سمجھو کہ ساری خدائی کے اتنے لمبے چوڑے حساب میں اس کو کچھ زحمت پیش آئے گی یا اس میں زمانہ صرف ہو جائے گا۔ وہ سارا حساب ایک لمحہ میں سب کے سامنے رکھ دے گا۔ اس کی 'کتاب مبین' ہر شخص کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا سارا ریکارڈ اس کے آگے پیش کر دے گی۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ ۶۳-۶۷

'قل من ینجیکم من ظلمات البر والبحر'۔ 'ظلمات' مصائب اور آفات کی تعبیر ہے۔ سمندر کی تاریکیوں کا ذکر قرآن نے سورۂ نور میں یوں فرمایا ہے۔ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ ۴۰۔ نور (یا کسی گہرے سمندر کی تاریکیاں جس میں موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اور اس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوں۔ تاریکیوں کے اوپر تاریکی۔ جب اپنا ہاتھ نکالے تو وہ بھی اس کو سجھائی نہ دے) اسی طرح کے طوفانوں اور مصائب سے آدمی کو خشکی میں بھی سابقہ پیش آجاتا ہے۔

'تدعونہ تضرعا وخفیۃ'۔ 'تدعون' 'ینجیکم' کی ضمیر مفعول سے حال پڑ رہا ہے۔ لفظ کی تحقیق آیت ۴۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بالمقابل 'خفیۃ' کا لفظ ہے جس کے معنی چپکے چپکے کے ہیں۔ اس وجہ سے تضرع کے معنی گڑگڑانے اور آہ وزاری کے

ساتھ التجا و فریاد کرنے کے ہوں گے 'لئن انجانا الایہ' اسی دعا کا بیان ہے جو اس طرح کے حالات میں ہر شخص کے دل اور زبان پر ہوتی ہے۔

او یلبسکم شیعاً الایہ' 'لبس' کے معنی 'خلط' یعنی ملانے اور گڈمڈ کرنے کے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ تم کو گروہ در گروہ کرکے آپس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا کر دے۔

'وکذب بہ قومک' میں ضمیر کا مرجع وہ عذاب بھی ہو سکتا ہے جس کا آیت ۵۸ میں ذکر ہے اور قرآن بھی ہو سکتا ہے جو اس عذاب کی خبر دے رہا ہے اور جس کی طرف آیت ۵۷ میں اشارہ ہے۔ 'لکل نبأ مستقر' 'نبأ' کسی اہم حادثہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس عذاب کی خبر ہے جو قرآن دے رہا تھا۔ 'مستقر' موضع استقرار اور وقت استقرار دونوں مفہوم میں ہو سکتا ہے، نیز مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے وقت استقرار کے مفہوم میں لیا ہے۔

انسان کی ایک نفسیاتی بیماری اور توحید کی ایک انفسی دلیل

ان آیات میں انسان کی ایک نفسیاتی بیماری سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور ساتھ ہی توحید کی ایک نفسیاتی دلیل کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ سیاق کلام وہی مطالبہ عذاب کی تردید کا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تب تو گڑگڑا گڑگڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے خدا نے نجات دی تو اب اس کا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزاروں گا۔ لیکن جب اس سے نجات پا جاتا ہے تو پھر ناشکری و نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گیا ہے اب کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتا یہاں تک کہ اگر خدا کی پکڑ سے اس کو ڈرایا جاتا ہے تو ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب دکھا دو تو مانوں گا۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ سمندر میں یا خشکی میں جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہو تو کون تم کو اس گرداب مصیبت سے نجات دیتا ہے جبکہ تم خدا ہی کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو اور یہ عہد کرتے ہو کہ اگر خدا نے ہمیں آفت سے بچایا تو ہم اس کے شکرگزار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے؟ پھر خود ہی اس کا جواب دلوایا کہ وہ خدا ہی ہے جو تمہیں اس آفت سے بھی نجات دیتا ہے اور دوسری تمام مصیبتوں سے بھی وہی نجات دیتا ہے، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی اور خواہ تم ان کے لیے اس کو پکارو یا نہ پکارو، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ اس کے بعد پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔

یہاں دو باتیں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔ ایک توحید کی نفسیاتی دلیل جو ضمناً بیان ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ جب انسان کسی سخت مصیبت میں پھنستا ہے تو وہ خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، دوسرے

تمام سہارے اس کے نزدیک بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا اعتماد جاگزیں ہے۔ دوسری چیزیں محض بناوٹی ہیں جو آزمائش کی بھٹی میں پڑنے کے بعد جھوٹے ملمع کی طرح اڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل قرآن میں مختلف اسلوبوں سے نہایت موثر تمثیلوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اس کی پوری وضاحت اپنی کتاب "حقیقت توحید" میں مستقل عنوان سے کی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں شکر اور شرک کو دو مقابل چیزوں کی حیثیت سے رکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی بتوں کو پوجے بلکہ وہ استکبار بھی شرک ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنی تدبیر و قابلیت کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور پھر فخر و غرور کے نشہ میں اکڑتا، دندناتا، اتراتا اور من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ حالت شکر کی ضد ہے اور جس کے اندر یہ خناس سما جاتا ہے وہ خود اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس ذہنیت کی تصویر سورہ کہف میں اس طرح کھینچی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۝ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ

اور ان کے لئے دو شخصوں کی تمثیل بیان کرو۔ ان میں سے ایک کے لئے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، ان کو کھجور کے درختوں سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی اگائی۔ دونوں باغ خوب پھل لائے۔ کچھ کمی نہیں کی ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی۔ اس میں پھل آئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا، اور وہ اس سے مفاخرت کر رہا تھا، کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور جمعیت میں قوی ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنی جان پر آفت لا رہا تھا اور بولا میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہو سکے گا اور میں قیامت کے ہونے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف جانا ہی ہوا تو اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے جواب میں کہا

وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ○ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۔ (کہف ۳۲-۳۸)

کیا تم نے اس خدا کی ناشکری کی جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر ایک مرد بنا کھڑا کیا لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے، میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناؤں گا۔

'قُل ھوالقادر الاٰیۃ' یعنی یہ نہ سمجھو کہ آج اگر امن و اطمینان کی زندگی حاصل ہے تو پھر کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتے۔ خدا جب چاہے تمہارے اوپر سے پتھر برسا دے، بجلی گرا دے، گردباد بھیج دے۔ اسی طرح جب چاہے، عین تمہارے پاؤں کے نیچے سے زلزلہ، سیلاب یا کوئی اور آفت ارضی بھیج دے۔ یہ نہیں تو تمہیں آپس ہی میں قبیلہ قبیلہ، گروہ گروہ اور قوم قوم کو باہم دگر ٹکرا دے اور ایک دوسرے کے ظلم و تشدد کا مزا چکھا دے۔ ان میں سے ہر بات، ہر وقت خدا کی قدرت میں ہے۔ فرمایا، دیکھو کس طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اور اپنے اختیار و تصرف کی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے بیان کرتے ہیں کہ یہ سمجھیں لیکن یہ سمجھنے کے بجائے ہمارا عذاب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

'وکذب بہ قومک وھوالحق' یعنی قرآن نے ان کو جس عذاب کی دھمکی دی ہے وہ ایک امر واقعی اور شدنی ہے لیکن تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔ اب ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو اور ان سے کہہ دو کہ 'لست علیکم بوکیل' میں تم پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں کہ لازماً تمہیں ایمان و اسلام کی راہ پر چلا ہی دوں ورنہ مجھ سے پرسش ہو جائے گی۔ میرے اوپر تو ذمہ داری صرف انذار و تبلیغ کی تھی وہ میں نے ادا کر دی۔ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اب اگر تم عذاب کے لئے مچلے ہوئے ہو تو 'لکل نبا مستقر' ہر بات کے ظہور کے لئے خدا کی تقویم میں ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت مقرر آجائے گا تم خود اس کو دیکھ لوگے۔

ہم سے طلب فرمائیں

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر ترین لیکن جامع ترین کتاب

النبی الخاتم

تالیف: مولانا سید مناظر احسن گیلانی، ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۸۰۔ کاغذ سفید، قیمت ۳/- روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

باب وصف الکبر

(۲)

ماخوذ از کتاب الرعایہ تالیف حضرت حارث محاسبیؒ

ترجمہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ہم نے کہا "آپ نے تکبر کے متعلق تو بہت کچھ بتایا، اب تکبر کی اقسام کے متعلق بھی کچھ بتائیے"۔ انہوں نے کہا کہ تکبر کی دو قسمیں ہیں: (ا) بندوں اور اللہ تعالےٰ کے درمیان (ب) بندوں اور بندوں کے درمیان۔ جو تکبر بندے اور اللہ تعالےٰ کے درمیان ہوتا ہے وہ، وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَنْکِفُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ"

جو لوگ میری اطاعت سے تکبر (انکار) کرتے ہیں یقیناً ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے"۔

نیز فرمایا "لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط (۴-۱۷۲)

اور مسیح ہرگز خدا کا بندہ بننے سے انکار نہیں کریں گے اور نہ مقرب فرشتے (انکار کریں گے)

یہ کبر نہایت شدید قسم کا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان بھی لائقِ غور ہے:۔

"وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا۔ (۲۵-۶۰)

اور جب ان کافروں سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو پوچھتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا ہم اُسے سجدہ کریں جسے سجدے کا تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ اور اس بات سے انہیں اور زیادہ نفرت ہوتی ہے۔

نیز فرمایا۔" نُفُوْرًا اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ " (۳۵-۴۲) نفرت ہی میں ترقی ہوئی، دنیا میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے سے ـــ اسی وجہ سے ابلیس نے آدم کے خلاف کبر اختیار کیا تھا، یہاں تک کہ ان سے دشمنی پر آمادہ ہوگیا، اور اللہ کی اطاعت میں سجدے سے انکار کردیا۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:" جب ابلیس ابن آدم کو سجدہ کرتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھ پر افسوس ہے! اُسے سجدے کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کر لیا اور مجھے سجدے کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ نہ کیا اور مردود ہوگیا۔"

اسی طرح یحییٰ بن جعدہ سے مروی ہے کہ جو شخص اپنی پیشانی اللہ کے لئے سجدے میں رکھ دیتا ہے وہ کبر سے بری ہوگیا، یعنی اس کبر سے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔ جان لو کہ یہ باب ہم نے اسی لئے لکھا ہے کہ بندے اور اللہ کے درمیان کبر کو واضح کردیں، نیز یہ کہ بندہ کس طرح رسولوں کی مخالفت کرتا ہے اور کس طرح اللہ کے احکام کی مخالفت کرتا ہے۔ متکبر آدمی، انبیاء کی اتباع اور اطاعت سے انکار کردیتا ہے اور اس کے دل میں اللہ تعالےٰ کے خلاف عناد کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر وہ اس کی کتاب (قرآن مجید) کو بھی ردّ کردیتا ہے اور اس کی حجت کا بھی انکار کردیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے انہی منکرین اور کفار کا قول نقل فرمایا ہے:۔

" اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ؟" (۲۳-۴۸)

انہوں نے کہا کیا ہم ایسے دو شخصوں پر ایمان لے آئیں جو ہماری طرح کے آدمی ہیں، حالانکہ ان کی قوم تو خود ہمارے زیر حکم ہے؟

اور کہا " وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ط (۲۳-۳۴)

اور اگر تم اپنے جیسے ایک آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بیشک تم گھاٹے میں ہو۔

پس ان کافروں نے انکار کیا اس بات سے کہ وہ اتباع کریں ان کی، جو تخلیق میں انہی کی مثل ہیں اور کہا۔

" لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْنَرٰى رَبَّنَا ؟ " (۲۵-۲۱)

ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں۔

ان کے جواب میں حق تعالےٰ نے فرمایا:۔

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا" (۲۵-۲۱)

بیشک یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حدِّ انسانیت سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

اور کہا " لَوْ لَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا " اس کے پاس فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا (۲۵-۷)

نیز کہا " لَوْ لَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ " (۱۱-۱۲) انہوں نے کہا اُس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا (اگر وہ سچّا ہے) یا اس کے ساتھ ساتھ کوئی فرشتہ بھی کیوں نہیں آیا (جو ہمیں بتاتا کہ یہ واقعی نبی ہے)

اور فرعون نے کہا " اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ط یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے (تو مجھے یقین ہو جاتا)

اللہ تعالےٰ نے فرمایا وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ " (۲۸-۳۹) اور فرعون اور اس کی فوجوں نے ناحق دنیا میں سر اٹھا رکھا تھا۔ پس اُس نے اس بات سے بھی انکار کیا کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے، اور اس کی عبادت کرے یہاں تک کہ اس نے خود الوہیت اور ربوبیت کا دعوےٰ کر دیا۔

وہب فرماتے ہیں کہ سیدنا موسیٰؑ نے فرعون سے کہا کہ تو ایمان لے آ تجھے جنت بھی ملے گی اور یہ دنیاوی حکومت بھی تیرے پاس رہے گی " اس نے جواب دیا کہ میں اپنے وزیر ہامان سے مشورہ کر لوں تو جواب دوں گا۔ چنانچہ اس نے ہامان سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا " اس وقت تو خود رب ہے لوگ تیری عبادت کرتے ہیں لیکن جب تو اللہ کی بندگی اختیار کرے گا اور بندہ بن جائے گا تو پھر تجھے خود بندگی اور اطاعت کرنی پڑے گی اور کوئی شخص تیری عبادت نہیں کرے گا " یہ سن کر فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تکبّر نے اسے اس بات سے باز رکھا کہ وہ اپنے جیسے انسان کے سامنے تواضع سے کام لے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کے سامنے اپنے تکبر کا اظہار شروع کیا جیسا کہ حق تعالےٰ نے فرمایا " لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ " (۲۵-۲۱) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں۔

اور انہوں نے ان لوگوں کی تحقیر و تذلیل شروع کی جو انبیاء کی اتباع کرتے تھے۔ اسی ذہنیت کے لوگوں نے حضرت نوحؑ سے بھی یہی کہا تھا کہ ہم تمہارے متبعین کو کمزور اور عاجز اور مسکین دیکھتے ہیں۔ اور قریش نے بھی یہی کہا تھا جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

" لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳-۳۱) اور کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الٰہی ہے) تو ان دونوں بستیوں میں رہنے والوں میں

سے بڑے کسی شخص پر کیوں نہیں نازل ہوا؟

قتادہ فرماتے ہیں کہ قریش کی مراد ولید بن المغیرہ اور ابو مسعود ثقفی سے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان اشخاص کی اطاعت اور اتباع کریں جو ریاست اور ثروت اور دولت کے اعتبار سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑا ہو۔ حق تعالےٰ نے ان کے جواب میں فرمایا۔ "اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ ط (۴۳-۳۲) کیا یہ لوگ آپؐ کے رب کی رحمت (نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ اور قریش یہ بھی کہتے تھے کہ جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع کرتا ہے اسے حقیر سمجھو کیونکہ اگر وہ فہیم ہوتا تو اس کی اتباع میں ہم سے سبقت نہ لے جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم خیر اور نیکی میں اُن سے بہتر ہیں۔ اسی طرح قارون کا یہ قول ہے۔ "قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ط (۲۸-۷۸) قارون نے کہا کہ مجھ کو تو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے۔

وہ یہ سمجھتے تھے کہ نیکی کے لئے ہم لوگ ہی مخصوص کئے گئے ہیں، نیز وہ لوگ مسلمانوں کو خیر کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

"لِيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ط" (۶-۵۳)

تاکہ یہ لوگ کہا کریں کہ کیا یہ لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے ان پر اللہ نے زیادہ فضل کیا ہے۔

یہ ان کے استکبار اور دوسروں کی تحقیر اور اپنی بڑائی کی وجہ سے تھا اور اسی لئے انہوں نے اللہ رب العزت کے احکام کو ٹھکرایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ یہ سب کچھ استکبار کی بنا پر تھا حتیٰ کہ بہت سے اہل کتاب نے بھی حق کی مخالفت کی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ حق یہی ہے جو آپؐ فرما رہے ہیں اسی لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا:۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ" (۲-۸۹)

پس جب آئی وہ چیز ان کے پاس جس کو وہ خوب پہچانتے تھے تو اس کا انکار کر دیا۔

نیز فرمایا:۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ" (۲۷-۱۴)

ظلم کی راہ سے ان کے بالکل منکر ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں نے انکا یقین کر لیا تھا

اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ کس چیز نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا۔ چنانچہ فرمایا "ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" ظلم اور تکبر کی بنا پر (۲۷-۱۴)

انہوں نے برتری کا ارادہ کیا حالانکہ وہ اس معاملے میں ظالم تھے۔ کیا تجھے اس بات کا علم

نہیں کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :"

"تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۔"

یہ عالمِ آخرت ہم انہی لوگوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا (۲۸ - ۸۳)

قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا : "اے محمد (صلعم) ہم آپؐ کے پاس کس طرح بیٹھ سکتے ہیں جبکہ آپؐ ہمارے غلاموں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ؟ اسی بات پہ اللہ تعالےٰ نے یہ حکم نازل فرمایا :

"وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ (۶ - ۵۲)

اور ان لوگوں کو اپنے پاس سے نہ نکالئے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے اس کی رضا چاہتے ہیں ۔ ان کا حساب آپ کے متعلق نہیں اور آپ کا حساب ان کے متعلق نہیں

نیز فرمایا :-

"وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اور دنیوی زندگی کی زینت کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں ۔(۱۸-۲۸)

مراد یہ ہے کہ وہ دنیا میں سربلندی کے خواہاں ہیں اور جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو کہیں گے ، جیساکہ حق تعالےٰ نے ہمیں ان کے متعلق خبر دی ہے ، کہ ہم تو صرف شریر لوگوں ہی کو دیکھتے تھے یعنی یہ بتائیں گے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کے ساتھیوں کو حقیر سمجھتے تھے ، جیساکہ ابوجہل ، حضورؐ کے ساتھیوں مثلاً عمارؓ ، صہیبؓ اور مقدادؓ وغیرہم کے متعلق کہا کرتا تھا ۔

انوارِ مجدّدی

یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات ، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم وحواشی مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ، صفحات ۳۸۴ ، مجلد مع ڈسٹ کور - قیمت چار روپے صرف

دارالاشاعت الاسلامیہ ، کوثر روڈ ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور ۔

اسلامی ریاست

مولانا امین احسن اصلاحی

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

—— زیر طبع کتاب کا ایک باب: ——

پچھلے مباحث سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی ریاست ہے جس کی بنیاد اصول و عقائد پر ہے نہ کہ نسل، نسب یا خاندان پر۔ تمام مسلمان جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر متفق ہیں، اس ریاست میں بالکل مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر یہ کہ ایک شخص دین اور تقویٰ، تفقہ اور اجتہاد کے اعتبار سے دوسرے پر فضیلت رکھتا ہو۔ ریاست کے اولوالامر یا اربابِ حل و عقد کو ریاست میں جو سربراہی کا مقام حاصل ہوتا ہے، وہ بھی جیسا کہ پچھلے مباحث سے واضح ہوا ان کے علم و تقویٰ ہی کی بنا پر حاصل ہوتا ہے نہ کہ کسی خاندان یا نسب سے تعلق رکھنے کی بنا پر۔

یہ حقیقت قرآن و حدیث میں اتنی وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اس پر دلائل نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک حدیث کی بنا پر جس میں فرمایا گیا ہے کہ الائمۃ من قریش (خلفا قریش میں سے ہوں گے) عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں خلیفہ کے لئے قریشی ہونا شرط ہے کوئی غیر قریشی خلافت کے منصب پر سرفراز ہونے کا حق دار نہیں ہے۔

اگر اس حدیث کا یہی مطلب لیا جائے جو عام طور پر لیا گیا ہے تو اس سے نہ صرف اسلامی نظام حکومت کی وہ بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے بلکہ اس سے ان معترضین کے اعتراضات کو بھی بڑی قوت حاصل ہو جاتی ہے جنہوں نے اسلامی نظام حکومت پر مخالفانہ تنقیدیں کی ہیں۔ مطلب کی وضاحت کے لئے ہم ان اعتراضات میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔ مثلاً:

اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اسلام میں مساوات کا جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں نسل و نسب کی بنا پر کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے یہ دعویٰ غلط ہے اس لئے کہ جب خلیفہ ہونے کے لئے قریشی ہونا

شرط لازم ہے، یہاں تک کہ اس کے حق میں مسلمانوں کا اجماع بیان کیا جاتا ہے تو پھر مساوات کہاں باقی رہی؟ پھر تو قریش کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں وہی برتری حاصل ہوگئی جو یہود میں بنی لاوی کو حاصل تھی یا ہندوؤں میں برہمنوں کو۔ جس طرح ہندوؤں میں ان کے مذہبی قانون کی رو سے کوئی ویش یا شودر حکمرانی کا منصب حاصل نہیں کرسکتا اسی طرح کی بات یہ ہوئی کہ کوئی غیر قریشی مسلمانوں کا حکمران نہیں ہوسکتا۔

دوسرا اعتراض اس کی بنیاد پر یہ کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بیان کردہ اصولوں پر اسلام کے اجتماعی و سیاسی نظام کو قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ زندگی بھر تو انہوں نے مساوات کی تعلیم دی اور نسلی و خاندانی برتری کے خلاف جہاد کیا لیکن وفات کے وقت نعوذ باللہ اپنی قائم کردہ حکومت اپنے خاندان کے سپرد کرکے چلے گئے۔

اسی حدیث کی آڑ لے کر تحریک خلافت کے زمانے میں انگریز مستشرقین اور مدبرین نے تحریک کو دبانے اور اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ مسلمان خواہ مخواہ کے لئے ترکوں کی خلافت کے حق میں آسمان و زمین ایک کئے ہوتے ہیں۔ ان کے پیغمبر کی تعلیم کی رو سے کوئی غیر قریشی تو خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا تو ترکوں کی خلافت کہاں سے دین و شریعت بن گئی؟

اس زمانے میں اسی حدیث کا سہارا لے کر بعض ذہین لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت دین کے اصولوں میں ترمیم و تنسیخ ہوسکتی ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ اگرچہ مساوات کی تعلیم اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، قرآن نے بھی اس کی تعلیم دی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زندگی بھر اس کا وعظ فرمایا لیکن حکمت عملی کا تقاضا چونکہ یہی ہوا کہ خلافت قریش ہی کے ہاتھ میں رہے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے وقت یہ وصیت فرماگئے کہ خلفا قریش میں سے ہوں گے۔

حدیث الائمہ من قریش کا محمل

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات و شبہات جو اسلام کے نظام اجتماعی و سیاسی پر کئے گئے ہیں وہ تمام تر نتیجہ ہیں اس بات کا کہ لوگوں نے اس حدیث کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر اس کو امر یا خبر یا وصیت کے مفہوم میں لیا۔ حالانکہ یہ نہ تو امر ہے نہ خبر نہ وصیت بلکہ یہ ایک قضیہ اور ایک نزاع کا فیصلہ ہے۔ یہ قضیہ اگرچہ ایک قضیہ کی شکل میں حضورؐ کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا لیکن یہ ذہنوں میں موجود تھا اور اس کے اثرات وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ حضورؐ کے لئے یہ اندازہ کرلینا کچھ مشکل نہ تھا کہ آپ کی وفات کے بعد یہ قضیہ ایک نزاع کی شکل اختیار کرسکتا ہے اور اس سے امت میں انتشار پیدا ہوسکتا ہے۔ اس وجہ سے آپؐ نے اپنی زندگی ہی میں فیصلہ فرما دیا کہ آپ کے بعد خلافت کے حقدار قریشی ہیں۔

صفحہ ۲۰۳

جلد ۲

اس نزاع میں ایک طرف قریش تھے اور دوسری طرف انصار۔ حضورؐ کے زمانہ میں مسلمانوں میں یہی دو گروہ قابل ذکر اور سیاسی زور و اثر رکھنے والے تھے۔ ہر چند اسلام نے ان کو جاہلی تعصبات سے پاک کر دیا تھا لیکن قبائلی حمیت کے فطری اور جائز رجحانات ان دونوں کے اندر زندہ تھے۔ حضورؐ کی حیات مبارک میں تو اس امر کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ بات اپنے حدود سے آگے بڑھ کر کسی بگاڑ کی شکل اختیار کرے گی لیکن حضورؐ کے بعد اس قسم کا اندیشہ بے محل نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ ان کے درمیان حصول اقتدار کی کش مکش کا اندیشہ کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا جتنا اندیشہ اس بات کا تھا کہ خدمت دین میں مقابلہ کا جذبہ جو ان دونوں کے اندر موجود ہے مبادا وہی ان کو کسی کش مکش میں مبتلا کر دے اس وجہ سے حضورؐ نے مناسب خیال فرمایا کہ اپنی زندگی ہی میں اس نزاع کا فیصلہ فرما دیں۔

یہ نزاع چونکہ امامت عامہ کے لئے تھی، صرف کسی مسجد کی امامت کے لئے نہ تھی اس وجہ سے ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح اگر حاصل ہو سکتی تھی تو وہ دو ہی چیزوں کی بنا پر حاصل ہو سکتی تھی۔ ایک دین اور اس کی خدمات۔ دوسری سیاسی زور و اثر۔ جہاں تک دین اور دینی خدمات کا تعلق ہے یہ دونوں کچھ برابر برابر سے تھے۔ کچھ پہلو اگر قریش (یا بالفاظ دیگر مہاجرین) کے نمایاں تھے تو چند پہلو انصار کے بھی بہت روشن تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان دونوں کی دینی خدمات کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے کچھ اس طرح کے ہم وزن الفاظ استعمال فرماتے ہیں کہ دونوں مساوی الوزن معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دونوں کی دینی خدمات کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ کسی کا پلڑا بھی جھکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس وجہ سے اس پہلو سے تو ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے کوئی وجہ موجود نہ تھی۔

لیکن دوسرے پہلو یعنی سیاسی زور و اثر کے لحاظ سے قریش کو انصار پر نمایاں فوقیت حاصل تھی۔ سیاسی زور و اثر تنہا تو اسلام میں کوئی وقعت رکھنے والی چیز نہیں ہے لیکن دین کے ساتھ مل کر یہ چیز ایک وجہ ترجیح بن جاتی ہے۔ امامت عامہ یعنی خلافت و امامت جس طرح دین کو چاہتی ہے اسی طرح سیاسی زور و اثر کو بھی یہ چاہتی ہے۔ قریش کو چونکہ جاہلیت میں بھی دینی پیشوائی اور سیاسی قیادت کا منصب حاصل رہا تھا، اس وجہ سے اسلام لانے کے بعد یہ چیز اسلام میں بھی ان کو حاصل ہو گئی۔ اہل عرب کے لئے ان کی اطاعت کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں تھی بلکہ جانی پہچانی ہوئی چیز تھی۔ وہ جن کی اطاعت جاہلیت میں کرتے رہے تھے، بڑی آسانی کے ساتھ بغیر کسی کراہت کے، ان کی اطاعت اسلام میں بھی کر سکتے تھے بشرطیکہ دین مانع نہ ہو، سو الحمدللہ اس قسم کا کوئی مانع باقی نہیں رہا تھا بلکہ قریش نے اسلام کی خدمت میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ دونوں چیزیں ان کے اندر جمع ہو گئی تھیں جو اسلام میں منصب خلافت و امارت کے لئے استحقاق پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے الائمۃ من قریش فرما کر انصار کے مقابل میں قریش کے حق میں فیصلہ فرما دیا۔ اس فیصلہ نے اس نزاع کے ختم کرنے میں بڑا کام دیا جو

حضورؐ کی وفات کے معًا بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حضورؐ نے یہ فیصلہ قریش کے حق میں ان کی قرشیت کی بنا پر دیا۔ اگر اس وقت کوئی تیسری جماعت میدان میں موجود ہوتی اور وہ اپنی دینی خدمات اور سیاسی قوت و دبدبہ کے لحاظ سے مذکورہ دونوں جماعتوں پر فوقیت رکھنے والی ہوتی تو حضورؐ یہی فیصلہ اس کے حق میں بھی دے سکتے تھے۔

چند شبہات

اگرچہ حدیث کا جو محمل ہم نے بتایا ہے وہ بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں چند شبہات پیدا ہوں مثلاً :-

ایک یہ کہ کسی معاملہ میں ایک حکم دینے اور کسی قضیہ کا فیصلہ کر دینے میں آخر وہ کیا باریک فرق ہے جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ امر نہ تھا، بلکہ ایک قضیئے کا فیصلہ تھا۔ پھر یہ بات بھی محتاج وضاحت ہے کہ حضورؐ نے خواہ انصار پر قریش کے حق خلافت کو ترجیح دی ہو یا تمام عجم و عرب پر اس سے نفس مسئلہ زیر بحث پر آخر کیا اثر پڑتا ہے؟

دوسرا یہ کہ تاریخ میں اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ حضورؐ کے حین حیات انصار اور مہاجرین کے درمیان خلافت کے متعلق کوئی قضیہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا یہ کہ آخر کسی شخص کو یہ علم کس طرح ہو گیا کہ حضورؐ نے قریش کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس سے مقصود دراصل اسی قضیہ کا فیصلہ تھا۔ کیا حضورؐ نے خود اس کی صراحت فرمائی تھی یا آپ کے کلام اور اس کے متعلقات میں کوئی قرینہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے یہ منشا مترشح ہوتا ہو؟

چوتھا یہ کہ فلاں اور فلاں علما نے اس امر پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی غیر قرشی مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ یہ تمام شبہات بالکل سرسری و سطحی ہیں، لیکن ممکن ہے کہ ان سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا ہو اس وجہ سے بالاجمال ہم ان کو بھی صاف کئے دیتے ہیں۔

شبہات کے جواب

جہاں تک پہلے شبہ کا تعلق ہے اس کے باب میں گزارش ہے کہ کوئی مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں فی الواقع فرق ہے اور وہ فرق ذرا باریک ہے اس وجہ سے اس کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اور سمجھانے کی بھی۔ وہ فرق یہ ہے کہ کسی نزاع کا جو فیصلہ ہوا کرتا ہے اس کا تعلق صرف متعلق پارٹیوں سے ہوا کرتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آیا کرتا کہ اگر اسی حق کے لئے کوئی تیسرا فریق اس سے بہتر وجوہ استحقاق کے ساتھ سامنے آتے جو وجوہ ایک فریق کی دوسرے پر ترجیح کا باعث ہوئے ہیں، جب بھی اسی کو ترجیح حاصل رہے گی۔ اگر حضورؐ کا یہ ارشاد کہ خلفا قریش میں سے ہوں

ایک مستقل حکم ہے تب تو صحیح بات یہی ہے کہ کسی اسلامی حکومت کا جائز حکمران کوئی غیر قرشی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر تو ہر اسلامی حکومت میں خلافت کے منصب کے لئے کسی قرشی کا تلاش کرنا ضروری ہوگا۔ اگر اس حکومت میں کوئی قرشی موجود نہیں ہوگا تو باہر سے۔ اگر کسی ملک میں موجود ہوگا کوئی قرشی مہیا کرنا پڑے گا۔ اور اگر یہ ایک قضیہ کا فیصلہ ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ خلافت کے معاملہ میں انصار کے بالمقابل قریش کو ترجیح حاصل تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتے گا کہ قریش کو یہ ترجیح دنیا کے ہر گروہ کے مقابل میں ہمیشہ کے لئے حاصل ہے خواہ وہ وجوہ ترجیح کے لحاظ سے ان سے زیادہ حقدار ہو۔

نفس مسئلہ زیر بحث پر اس کا اثر یہ پڑے گا کہ ترجیح کا پہلو معین ہو کر سامنے آجائے گا۔ وہ اس طرح کہ یہ دیکھا جائے گا کہ نزاع کس امر میں تھی اور کن وجوہ کی بنیاد پر تھی اور فیصلہ کس کے حق میں ہوا۔ اگر قضیہ کی روداد سے یہ ثابت ہوگا کہ انصار اور مہاجرین میں اختلاف خلافت کے لئے تھا اور بنائے اختلاف نسب و حسب تھا۔ اور پھر یہ معلوم ہوگا کہ حضورؐ نے فیصلہ قریش کے حق میں دیا تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ خلافت کے معاملہ میں اصلی فیصلہ کن عامل درحقیقت حسب و نسب ہے اور اس اعتبار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بموجب قریش کو انصار پر ترجیح حاصل ہے۔ اور اگر معاملہ کی روداد سے یہ واضح ہوگا کہ اختلاف خلافت کے لئے تھا اور بنائے اختلاف یہ چیز تھی کہ انصار اپنی دینی و اسلامی خدمات اور اپنی سیاسی قوت و شوکت کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتے تھے اور قریش اپنی دینی و اسلامی خدمات اور اپنی سیاسی جمعیت و عصبیت کی بنا پر اپنے آپ کو اس کا حق دار خیال کرتے تھے اور حضورؐ نے فیصلہ قریش کے حق میں دیا تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اسلام میں خلافت و امارت کا استحقاق اس پارٹی کو حاصل ہوتا ہے جس کو اپنی دینی و اسلامی خدمات، اور اپنے سیاسی اثر و رسوخ کے اعتبار سے ملک کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ اس چیز میں حسب و نسب اور خاندانوں کے امتیازات کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اب ہر شخص خود غور کر کے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کے ارشاد کو ایک مستقل امر و حکم ماننے اور ایک نزاع یا قضیہ کا فیصلہ ماننے میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں واقع ہوتا ہے۔

دوسرے شبہ کے بارے میں گزارش ہے کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان کسی قضیہ کے موجود ہونے کے لئے یہی لازم نہیں ہے کہ یہ قضیہ براہ راست خلافت ہی کے لئے ہو۔ خلافت کا سوال تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی اٹھ سکتا تھا۔ قضیہ کے موجود ہونے کے لئے تنہا یہ چیز کافی ہے کہ انصار زور و اثر اور خدمت دین میں اپنے آپ کو قریش کے ہم رتبہ خیال کرتے رہے ہوں اور اس خیال کے سبب سے ان کے اندر فی الجملہ مسابقت اور مقابلہ کی اسپرٹ پائی جاتی رہی ہو۔ سو یہ واقعہ ہے کہ انصار کم از کم اپنے مرکز یعنی مدینہ میں اپنے آپ کو بڑی

طاقت سمجھتے تھے اور ان کا یہ سمجھنا بے جا نہیں تھا۔ پھر اسلام کو سربلند کرنے کے لئے انہوں نے جو عظیم خدمات انجام دی تھیں ان کی بنا پر وہ ہر میدان میں اپنے آپ کو مہاجرین کا مدمقابل سمجھتے تھے۔ ان کا یہ احساس اس قدر نمایاں تھا کہ جو شخص اس عہد کی تاریخ پر نگاہ رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے لیڈر سعد بن عبادہ کی ایک تقریر ملاحظہ فرمائیے :۔

یا معشر الانصار ان لکم سابقة فی الدین و فضیلة فی الاسلام لیست لقبیلة من العرب۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبث فی قومہ بضع عشرة سنة یدعوھم الی عبادة الرحمٰن و خلع الاوثان فما امن بہ من قومہ الا قلیل واللہ ما کانوا یقدرون ان یمنعوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا یعرفوا دینہ ولا یدفعوا عن انفسھم۔ حتیٰ اراد اللہ لکم الفضیلة وساق الیکم الکرامة وخصکم بالنعمة و رزقکم الایمان بہ وبرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم والمنع لہ ولاصحابہ والاعزاز لدینہ والجھاد لاعدائہ۔ فکنتم اشد الناس علیٰ من تخلف عنہ منکم واثقلہ علیٰ عدوکم

اے گروہ انصار، خدمت اسلام میں جو افضلیت و اولیت تم کو حاصل ہے عرب کے کسی قبیلہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو برسوں خدائے واحد کی پرستش اور شرک سے باز آنے کی دعوت دیتے رہے لیکن آپ کی قوم میں سے صرف تھوڑے ہی سے لوگ ایمان لائے۔ ان تھوڑے سے لوگوں کا بھی حال یہ تھا کہ خدا کی قسم یہ لوگ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر سکتے تھے نہ آپ کے دین کی تبلیغ کر سکتے تھے اور نہ خود اپنی ہی جانوں کی حفاظت کر سکتے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس شرف سے نوازا اور اس نعمت سے سرفراز کیا اور تمہیں اس بات کی توفیق حاصل ہوئی کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت کرو اور دین کو سربلند کرو اور دشمنان دین سے جہاد کرو اس کے بعد دین سے منحرف رہنے والوں پر سب سے زیادہ سخت تم رہے ہو، عام اس سے کہ یہ تمہارے اندر کے لوگوں میں سے تھے یا باہر کے لوگوں میں سے یہاں تک کہ خدا کے حکم کے آگے طوعاً یا کرہاً سب کو جھک جانا پڑا۔ دور والوں کو بھی اطاعت کرنی پڑی۔ اللہ نے تمہارے ذریعہ سے اپنے نبی کے لئے زمین کو مفتوح

من غیرکم حتیٰ استقاموا لامر
اللہ تعالیٰ طوعا وکرھا واعطی
البعید المقادة صاغرا وامراً
حتیٰ اثخن اللہ تعالیٰ لنبیہ بکم
الارض ودانت باسیا فکم
لہ العرب وتوفاہ اللہ
تعالیٰ وھو راض عنکم قریر
العین فشددو ایدیکم
بھذ الامر فانکم احق
الناس واولا ھو بہ فاجابوہ
جمیعا ان قد وفقت فی الرای واصبت
فی القول (الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ)

کر دیا اور تمہاری تلواروں کے ذریعہ سے عرب کو
مطیع بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا
سے تشریف لے گئے تو وہ تم سے خوش تھے اس وجہ
سے خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تم ہو اس کو
مضبوط ہاتھوں سے پکڑو، تمام انصار نے سعد کی اس
رائے سے اتفاق کیا ـــــ

انصار کے اسی احساس سے کبھی کبھی منافقین غلط فائدے بھی اٹھا لیتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بعض جذبات انگیز مواقع پر منافقین نے انصار اور مہاجرین کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف اس طرح بھڑکا دیئے ہیں کہ دونوں پارٹیوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تک سونت لی ہیں اور حالات اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔ مثلاً وہ واقعہ جو غزوہ مریسیع کے موقع پر پیش آیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ بھی کوئی اتفاقیہ طور پر نہیں پیش آگیا تھا بلکہ اس کے لئے بھی ایک سے زیادہ اسباب و محرکات پہلے سے موجود تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فتنہ کے بھڑکانے میں بھی زیادہ ہاتھ منافقین ہی کا تھا لیکن جب تک بھڑکنے کے لئے کچھ مادہ موجود نہ ہو اس وقت تک مجرد کسی کی دیا سلائی کیا کام کر سکتی ہے؟ ان تمام حالات کا سب سے زیادہ اندازہ اگر کسی کو ہو سکتا تھا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہو سکتا تھا اور حضورؐ ہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر ان خطرات کا سدباب بھی فرما سکتے تھے جن کے اس صورت حال سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل معقول اور قرین قیاس ہے کہ حضورؐ نے اپنی حیات مبارک ہی میں اس قضیہ کی موجودگی کو محسوس فرما لیا اور اس کے بارے میں ایک ایسا فیصلہ دے دیا جس سے اس فتنہ کو دبانے میں بڑی مدد ملی جو حضورؐ کی وفات کے معاً بعد منافقین نے اٹھا دیا تھا۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کچھ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اندر حضورؐ کی حیات مبارک میں نہ آپ کی وفات کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اور نہ آپ کے بعد آپ کی خلافت کا۔ اس طرح کا خیال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور اس عہد کے مسلمانوں کی ذہانت سے متعلق انتہائی بدگمانی کے مترادف ہے۔ اگر حضورؐ اس طرح کے معاملات میں امت کو اندھیرے میں چھوڑ گئے ہوتے تو لوگ پہلے ہی روز سے نہ معلوم کیا کیا فتنے اٹھا دیتے اور وہ بات بالکل غلط ہو کے رہ جاتی جو اس ملت کے بارے میں فرمائی گئی ہے کہ اس کی شب بھی اس کے دن کے مانند روشن ہے۔ اس زمانہ کے ہر مسلمان کو پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم تھی کہ حضورؐ ایک دن وفات پانے والے ہیں اور آپ کی وفات کے بعد اس امت میں خلافت قائم ہونے والی ہے جس کے اصول یہ یہ ہوں گے جس پر دور فلاں فلاں قسم کے آئیں گے، جس کا آغاز اس قسم کا ہوگا جس کے وسط کی یہ خصوصیات ہوں گی اور اس کے دور آخر میں یہ فتنے نمودار ہوں گے۔ یہ ساری باتیں نہایت تفصیل کے ساتھ احادیث میں موجود ہیں آخر یہ ساری حدیثیں صحابہ رضی کے ذریعہ سے لوگوں کو پہنچی ہیں، پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر وہ ایک ایسے معاملہ پر غور کیوں نہ کرتے رہے ہوں گے جس کا تعلق براہ راست خود ان کی اپنی زندگیوں سے تھا اور جس پر غور کرنا اور جس کے بارے میں رائے قائم کرنا اسلام میں کوئی گناہ کا کام بھی نہیں تھا۔ اگر غیر ضروری طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں وہ ساری حدیثیں نقل کر دیتے جو اس باب خاص میں وارد ہیں اور وہ شبہات بھی بیان کر دیتے جو مستقبل سے متعلق انصار کے ایک طبقہ کے ذہنوں میں پائے جاتے تھے۔

دوسرے اعتراض کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ جہاں تک حدیث الائمۃ من قریش کا تعلق ہے اس کے الفاظ تو واضح طور پر نہ یہ بتاتے کہ یہ امر ہے۔ نہ یہ بتاتے کہ یہ خبر ہے نہ یہ بتاتے کہ یہ کسی قضیہ کا فیصلہ ہے اور نہ یہ بتاتے کہ حکمت عملی کے تحت اصول مساوات کو توڑ کر قریش کو بربنائے نسب تمام عرب و عجم پر ترجیح دینے کے لئے وارد ہوتے ہیں۔ مجرد اس حدیث کے الفاظ ان مفہوموں میں سے کسی مفہوم کو بھی قطعی طور پر متعین کرنے والے نہیں ہیں اس وجہ سے اہل فن کے عام طریقہ کے مطابق اس حدیث کی تاویل کی جائے گی۔

تاویل کے معاملہ میں اہل تاویل کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی آیت یا حدیث کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اسلام کے دوسرے واضح اور قطعی احکام سے کسی تصادم کے بغیر اس کا مدعا متعین ہو جائے اور قرائن و حالات سے اس کی تائید و تصدیق ہو جائے۔

اب آیئے دیکھئے کہ ہم نے جو اس حدیث کو انصار و قریش کے مابین ایک قضیہ کے فیصلہ کے مفہوم میں لیا ہے اور نسب و خاندان کے بجائے قریش کی دینی خدمات اور پورے عرب پر ان کی دھاک کو، انصار کے مقابل میں ان کی ترجیح کا سبب قرار دیا ہے تو اس کے وجوہ کیا ہیں؟

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان، جیساکہ ہم نے اوپر عرض کیا، مسابقت اور مقابلہ کی ایک اسپرٹ موجود تھی جس سے منافقین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اس وجہ سے یہ اندیشہ بعید نہیں تھا کہ اس اسپرٹ سے منافقین حضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کے معاملہ میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ یہ اندیشہ مقتضی ہوا کہ حضورؐ اس بارے میں کوئی واضح فیصلہ دے دیں تاکہ اگر کوئی فتنہ سر اٹھائے تو اس کا موثر طریقہ پر مداوا ہو سکے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلہ کا اگر کوئی اندیشہ ہو سکتا تھا تو صرف انصار ہی کی طرف سے ہو سکتا تھا اس زمانہ میں پورے عرب میں انصار کے سوا کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو اپنی اسلامی خدمات اور اپنی سیاسی حیثیت کے لحاظ سے یہ درجہ رکھتی ہو کہ قریش کی ہمسری کا حوصلہ کر سکے اس وجہ سے دوسرے نہ اس قضیہ میں کوئی پارٹی بننے کا دم داعیہ ہی رکھتے تھے اور نہ اُن سے اس فیصلہ کے تعلق کی کوئی اور وجہ موجود تھی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں کوئی گروہ اپنی مذہبی خدمات اور اکثریت کے اعتماد کے حاصل ہونے کی بنا پر تو یہ حق رکھتا ہے کہ حکومت و خلافت کے معاملہ میں اس کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہو لیکن کسی خاص قبیلہ یا برادری سے ہونے کی بنا پر اسلام میں کسی کو کسی پر ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں بھی کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے :-

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ	اے لوگو! ہم نے تم کو جو خاندانوں اور گروہوں میں
مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ	تقسیم کیا ہے تو یہ محض اس لئے کہ یہ چیز تمہارے لئے
شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا	شناخت اور تعارف کا ذریعہ بنے۔ اللہ کے نزدیک
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ	عزت والا تم میں سے وہ ہے جو سب سے زیادہ
(الحجرات)	خدا سے ڈرنے والا ہے۔

اسی طرح حدیث میں وارد ہے کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر دین اور تقویٰ کے پہلو سے۔ قرآن اور حدیث کے ان نصوص کے ہوتے ہوئے الائمۃ من قریش کے یہ معنی لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس ترجیح میں کوئی دخل قریش کی قرشیت کو بھی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق بات یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے ان کو یہ ترجیح ان کی دینی خدمات اور ان کے اس عام اعتماد و رسوخ کی بنا پر دی ہو جو پورے عرب میں ان کو اس وقت حاصل تھا۔ یہاں تک کہ انصار بھی اس چیز میں ان کے مدمقابل نہیں ہو سکتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کے الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس ترجیح کا سوال درحقیقت انصار کے

مقابل ہی میں پیدا ہوا تھا اور وجہ ترجیح قریش کی نسبی برتری نہیں تھی بلکہ ان کا وہ رسوخ و اعتماد تھا جو پورے عرب میں ان کو حاصل تھا۔ چند روایات ملاحظہ ہوں :۔

حضرت ابوبکر رض انصار کے لیڈر سعد کو قائل کرنے کے لئے فرماتے ہیں :۔

لقد علمت یا سعد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال و انت قاعد قریش ولاة هذا الامر خیر الناس تبع لبرهم وفاجرهم تبع لفاجرهم فقال سعد صدقت	اے سعد تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سامنے یہ بات فرمائی تھی کہ اس خلافت کے حامل قریش کو ہونا چاہیئے کیونکہ عرب کے اخیار ان کے اخیار کے پیرو رہے ہیں اور ان کے اشرار ان کے اشرار کے۔

انہی حضرت ابوبکر رض کا ارشاد ہے :۔

ولم تعرف العرب هذا الامر الا لهذا الحی من قریش	اہل عرب قریش کے سوا کسی اور کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔

حضرت علی رض سے روایت ہے :۔

عن رسول الله صلی الله علیه وسلم الناس تبع لقریش صالحهم تبع لصالحهم وشرارهم تبع لشرارهم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اہل عرب قریش کے تابع ہیں ان کے نیک ان کے نیکوں کے اور ان کے بد ان کے بدوں کے۔

بعینہٖ یہی مضمون مختلف روایات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے اس بیان کا موقع و محل اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی جماعت کے اندر یہ خیال پایا جاتا ہو کہ آنحضور ؐ کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کی حامل وہ بھی ہو سکتی ہے تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اس بوجھ کے اٹھانے کے اس وقت صحیح اہل صرف قریش ہی ہو سکتے ہیں اس لئے کہ اہل عرب کا اعتماد انہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ اس زمانہ میں اس کلام کا اصلی مخاطب انصار کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ اور پھر اس امر پر غور کیجئے کہ قریش کی ترجیح کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس میں ان کے نسب اور برادری کا حوالہ ہے یا اس بات کا حوالہ ہے کہ جس طرح ان کو جاہلیت میں اہل عرب کا اعتماد حاصل رہا ہے اسی طرح اسلام میں بھی ان کو اہل عرب کا اعتماد حاصل ہے اس وجہ سے خلافت کے حقدار وہی ہیں۔ جس طرح جمہوری نظاموں میں ملک کی اکثریت کا اعتماد رکھنے والی پارٹی کو حکومت بنانے کا حقدار سمجھا جاتا ہے اسی طرح قریش کو ان کی دینی خدمات اور ان کے عام معتمد علیہ ہونے کی بنا پر حامل خلافت ہونے کا حقدار قرار دیا گیا۔

چوتھے اعتراض یعنی خلافت کے لئے قرشیت کی شرط پر اجماع کا جو ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اس اجماع سے مراد اگر وہی اجماع ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ میں بموجودگی تمام اکابر مہاجرین و انصار ہوا ہے تو اس اجماع کا پتہ تمام دنیا جہان کو ہے۔ ہم کو نہ اس کے وقوع سے انکار ہے اور نہ اس کی صحت سے۔ لیکن اگر اس اجماع سے کوئی اور اجماع مراد ہے تو اس کا پتہ صرف امام نسفی اور شہرستانی صاحب کو ہوگا۔ ان کے سوا کسی اور کو اس اجماع کا پتہ نہیں ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجماع کے متعلق ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوا ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصولوں کے مطابق ہوا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف اسی اجماع کی نہیں ہے کہ یہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوا ہے بلکہ اسلام کی پوری تاریخ میں ایک اجماع بھی ایسا نہیں ہے جو اسلام کے کسی اصول کو توڑ کر وجود میں آیا ہو۔ بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ اجماع کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف ہو تو وہ اجماع، اسلام کے شرائط اجماع کی رو سے اجماع ہی نہیں ہے وہ اجماع باطل ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جو اجماع ہوا ہے وہ اس بات پر نہیں ہوا ہے کہ خلافت کے معاملہ میں قریش کو ان کی قرشیت کی بنا پر ترجیح حاصل ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا یہ اجماع اس بات پر ہوا ہے کہ قریش کی دینی خدمات، ان کی سیاسی حیثیت اور ان کے اثر و اقتدار کی بنا پر ان کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہے اگر قریش کو یہ چیزیں حاصل نہ ہوتیں بلکہ وہ ان اعتبارات سے دوسروں کے مقابل میں فروتر ہوتے، تو یہ اجماع ہرگز ان کے حق میں نہ ہوتا۔ حالانکہ باعتبار نسب وہ ان چیزوں کے بغیر بھی قریش ہی رہتے، غیر قریش نہ بن جاتے۔ اگر اس معاملہ میں قریش کی قرشیت اصل چیز ہوتی تو قریش کے لیڈروں کا سقیفہ بنی ساعدہ میں بنیادی نقطہ بحث یہ ہوتا کہ اسلام میں خلیفہ بننے کے لئے قرشی ہونا شرط ہے اور ان کی طرف سے صرف ایک نقطہ کو ثابت کر دینے کے بعد ساری بحث ختم ہو جاتی لیکن آپ انصار اور مہاجرین دونوں کے لیڈروں کی تقریریں ابن قتیبہ کی الامامۃ والسیاسۃ یا تاریخ کی کسی کتاب میں پڑھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ دونوں کے سامنے وجوہ ترجیح کی فہرست میں وہی چیزیں ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر فی الواقع اسلام میں نسب اور برادری کے سوال کو یہ اہمیت ہوتی جو بتائی جا رہی ہے تو پھر خلافت کے اصلی حقدار بنی ہاشم تھے اس لئے کہ نسب کے شرف کے معاملہ میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اصلی سوال سیاسی زور و اثر اور عوامی اعتماد کا تھا اور یہ چیز قریش کو بحیثیت مجموعی، بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے تو حاصل تھی، لیکن ان کی شاخوں میں سے کسی شاخ کو یا ان کے افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں اس درجہ حاصل نہیں تھی کہ وہ اس استحقاق میں

اس وقت کے سارے حریفوں پر بازی لے جاتے۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے بھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ میرا یا امام کا قرشی ہونا شرط ہے بلکہ یہ فرمایا کہ امراء و خلفا قریش میں سے ہوں جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ کے اس فیصلہ کی بنیاد قریش کی سیاسی حیثیت پر ہے نہ کہ ان کے نسب و خاندان پر۔

اگر حضورؐ کے ارشاد کا صحابہ رضؓ نے یہ مطلب سمجھا ہوتا کہ خلافت کے لئے قرشیت کی شرط اسلامی دستور کی ایک دفعہ ہے اور پھر اس چیز پر سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کا اجماع ہو گیا ہوتا تو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ جو اس اجماع کے ایک رکن رکین تھے اپنے زمانہ میں خلافت کے لئے ایسے لوگوں کے نام لینے کی جرأت کس طرح فرماتے جو قرشی نہیں تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آخر وقت میں جب حضرت عمر رضؓ سے یہ خواہش کی گئی کہ آپ اپنے بعد خلافت کے لئے کسی کو نامزد فرما دیں تو انہوں نے بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کہ کس کو نامزد کروں؟ اگر معاذ بن جبل رضؓ زندہ ہوتے تو ان کو نامزد کر دیتا۔ اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا کہ امت محمدؐ کی زمام کس کے ہاتھ میں دے کے آئے ہو تو میں عرض کر دیتا کہ معاذ بن جبل رضؓ کے۔ اس لئے کہ میں نے تیرے رسول کو یہ فرماتے سنا تھا کہ معاذ بن جبل قیامت کے دن تمام علماء کے آگے آگے ہوں گے۔

اسی طرح انہوں نے سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضؓ کے متعلق فرمایا کہ اگر سالم رضؓ زندہ ہوتے تو انتخاب خلیفہ کے لئے جو شوریٰ میں نے بنائی ہے اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں خلافت کے لئے ان کو نامزد کر دیتا۔

غور فرمایئے کہ حضرت عمر رضؓ اس حسرت کے ساتھ معاذ بن جبل رضؓ کا نام لیتے ہیں حالانکہ وہ قرشی نہیں تھے بلکہ انصاری تھے۔ اگر خلافت کے لیے قرشیت کی شرط پر اجماع ہو چکا تھا اور اس کی حیثیت ایک دستوری حکم کی ہوتی تو کیا حضرت عمر رضؓ کو اس اجماع کا اور اسلام کے اس دستوری حکم کا پتہ نہیں تھا؟ اس اجماع کی حقیقت اور اسلام کے دستور سے حضرت عمر رضؓ زیادہ واقف ہیں یا نسفی صاحب اور شہرستانی صاحب؟ پھر یہ بھی نگاہ میں رہے کہ حضرت عمر رضؓ یہ بات اس زمانہ میں فرماتے ہیں جب قریش مٹ نہیں گئے تھے بلکہ اپنی پوری قوت و شوکت کے ساتھ باقی تھے اور ان کے اندر عثمان غنی رضؓ اور علی مرتضیٰ رضؓ کے پایہ کے لیڈر موجود تھے۔

پھر اس سے زیادہ عجیب تر معاملہ حضرت سالم رضؓ کا ہے۔ یہ قرشی تو درکنار نسلاً عربی بھی نہیں تھے بلکہ بالاتفاق عجمی تھے اور عجمی بھی کوئی آزاد عجمی نہیں بلکہ ابو حذیفہ رضؓ یا ان کی بیوی کے آزاد کردہ غلام۔ حضرت عمر رضؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ ہوتے تو وہ ان کو نامزد فرما دیتے۔

اصل یہ ہے کہ معاملہ قرشیت اور غیر قرشیت کا نہیں تھا بلکہ سوال عامۂ مسلمین کے اعتماد کا تھا۔ اس زمانہ میں قریش کو عام مسلمانوں کا جو اعتماد حاصل تھا یا ہو سکتا تھا اس کی بنا پر وہی خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے

کے اہل تھے اور اپنے اس زور و اثر کے سبب سے اگر وہ کسی انصاری یا کسی عجمی نژاد آزاد کردہ غلام کو بھی اپنا معتمد اور خلیفہ بنا لیتے تو وہ بھی اس ذمہ داری کو سنبھال سکتا۔ لیکن ان کے اعتماد کے بغیر کسی کا حکومت چلانا ناممکن تھا۔ اس وجہ سے حضورؐ نے فرمایا کہ خلفا قریش میں سے ہوں۔ اب آپ خود غور فرمایئے کہ عوام کے اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر حکومت چلانے کے معاملہ میں اگر کسی جماعت کو دوسری مقابل جماعتوں پر ترجیح دی جائے تو کیا یہ ترجیح وہ ترجیح ہے جس کے سبب سے اسلام کے اصول مساوات پر کوئی ضرب آئے۔ اس طرح کی ترجیح تو آج کے جمہوری نظاموں میں جمہوریت کا اصلی جمال سمجھی جاتی ہے لیکن ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ اسی چیز نے ہمارے ہاں نہ صرف اسلام کے ایک ستون کو ڈھا دیا بلکہ حکمت عملی کے نام سے دوسرے بہت سے ستونوں کو ڈھانے کے لئے ایک بہت بڑے فتنے کو بھی جنم دے دیا۔

ابن خلدون کا نظریہ اس بحث میں ہم مختصر طور پر یہاں ابن خلدون کے سیاسی نظریہ کی بھی وضاحت کئے دیتے ہیں

ابن خلدون کے مقدمہ پر جو لوگ گہری نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ اس کے سیاسی نظریہ کی ساری بنیاد سیاسی وحدت و عصبیت کے وجود پر ہے۔ یہ سیاسی وحدت و عصبیت اس کے نزدیک نسل و خون کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے۔ نسل و نسب کا اشتراک باہمی تعاون و تناصر پیدا کرتا ہے اور اس تعاون و تناصر سے حمایت و مدافعت اور حصول اقتدار کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور پھر حکومت وجود میں آتی ہے

ابن خلدون کے نزدیک سیاسی عصبیت جو حکومت کی بنیاد ہے اگرچہ وجود میں آتی ہے نسل و نسب کے اشتراک سے لیکن وہ نسل و نسب کو اسی وقت تک کوئی قابل لحاظ چیز قرار دیتا ہے جب تک اس کا شعور اس تعاون و تناصر کے پیدا کرنے میں مدد و معاون ہو جس کا ذکر ہوا۔ اگر نسب کا اشتراک یہ فائدہ نہ دے رہا ہو تو ابن خلدون کے نزدیک نہ صرف یہ کہ سیاست میں اس نسب کا کوئی لحاظ نہیں ہے بلکہ اس طرح کے نسب کے ادعاء کو وہ محض ایک وہم اور ایک خبط قرار دیتا ہے۔

اس کے اس فلسفہ کی رو سے قریش کے سیاسی زور و اثر کی بنیاد ان کی عصبیت پر تھی جس کے ساتھ دین نے مل کر ان کو خلافت کا مستحق بنا دیا کیونکہ پورے عرب میں اس اعتبار سے ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ جب تک ان کی یہ عصبیت قائم رہی وہ اس منصب کے اہل رہے جب یہ مضمحل ہو گئی دوسری طاقتور عصبیتوں نے ان کو چیلنج کیا اور حکومت ان کی طرف منتقل ہو گئی۔

ابن خلدون کا سیدھا سادا فلسفہ یہ ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ اب غور فرمایئے کہ اگر اس کے نزدیک قریش کے استحقاق خلافت کی بنیاد اس کی بالادستی پر ہے جو ان کو ان کی سیاسی عصبیت اور جماعتی زور و اثر کی بدولت دوسروں کے بالمقابل حاصل تھی تو اس کے اس نظریہ کو کوئی شخص صحیح مانے یا غلط لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس

سے اسلام کا کوئی اصول ٹوٹتا ہے۔ وہ تو اگر اس دور کا آدمی ہوتا تو شاید اپنی بات اس طرح کہتا کہ چونکہ اس وقت عرب کی تمام پارٹیوں میں اسلامی اور سیاسی دونوں نقطہ ہائے نظر سے قریش سب سے زیادہ طاقت اور اعتماد کے حامل تھے اس وجہ سے حضورؐ نے اپنی کو حکومت چلانے کے لئے منتخب کیا۔

ہم سے طلب فرمایئے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

- دعوت دین اور اس کا طریق کار
  صفحات ۳۱۲، قیمت ۷۵/۳ روپے
- تزکیۂ نفس
  صفحات ۳۴۴، قیمت ۶/- روپے
- اسلامی قانون کی تدوین
  صفحات ۱۶۰، قیمت ۳ روپے
  سستا ایڈیشن: " ۲ "
- عدالتی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ
  صفحات: ۱۲۸
  قیمت ۲/۲۵ روپے

حقیقت خلافت و ملوکیت

: تالیف :

علامہ سید محمود احمد عباسی

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیف

خلافت و ملوکیت کا مسکت جواب

سائز ۲۳ × ۳۶/۱۶ صفحات: ۵۶۸ : مجلد

قیمت: قسم اوّل سفید کاغذ معہ ڈسٹ کور: ۱۱/۰ روپے: قسم دوم نیوز پرنٹ ۶/۷۵ روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر (سابقہ امرت) روڈ، اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی - ڈی لٹ

اسلامی تحقیق

اس کے معنی و مدّعا اور دائرہ کار

(۳)

[اس اہم اور فکر انگیز مقالے کی دو اقساط اس سے قبل نومبر اور دسمبر ۱۹۶۸ء کے 'میثاق' میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر اصلاً انگریزی میں ہے اور راقم کی استدعا پر انہوں نے خود ہی اس کا ترجمہ بھی 'میثاق' کے لئے کیا ہے۔ دو اقساط کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب کچھ دوسرے اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ جنوری اور فروری ۶۹ء میں اس مقالے کا تسلسل قائم نہ رہ سکا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب پھر اس کے لئے وقت نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ تیسری قسط درج ذیل ہے اور چوتھی اور آخری قسط انشاء اللہ العزیز آئندہ ماہ شائع ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس اہم تحریر پر مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنا تاثر جن الفاظ میں رقم فرمایا تھا۔ دوبارہ ہدیہ ناظرین ہے :-

"قدیم و جدید فکر کے تصادم نے ہماری قوم کے ایک خاص تعلیم یافتہ طبقے میں اصلاحی ریسرچ کا جو احساس بیدار کیا تھا اگرچہ ہمارے نزدیک اس کا بیدار ہونا ایک فال نیک تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے صحیح رہنمائی اور صحیح تربیت نہ حاصل ہونے کی وجہ سے ایک ایسی غلط راہ اختیار کر لی کہ اب تک اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ بڑے ہی مایوس کن ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے کا حوصلہ کیا ان کے ذہن میں نہ تو اسلامی ریسرچ کا کوئی واضح تصور تھا اور نہ ان کے سامنے اس کے معین خطوط تھے۔ مغربی مفکرین اور خاص طور پر مستشرقین سے جو افکار و خیالات انہوں نے اخذ کئے، کوشش یہ کی کہ کسی نہ کسی طرح ان کا جوڑ اسلام سے ملا دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم و جدید میں جو بیگانگی پہلے تھی وہ نہ صرف شدت اختیار کر گئی بلکہ اب تو اندیشہ اس بات کا پیدا ہو چلا ہے کہ وہ دشمنی اور نفرت کی شکل اختیار کرے۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے سب سے مقدم کام یہ ہے کہ واضح طور پر یہ معین کیا جائے کہ اسلامی ریسرچ ہے کیا، اس کا مقصد اور اس کی غایت کیا ہے اس

ضروری ہے کہ ہم مخاطب کے معلوم سے آغاز کر کے اس کے نامعلوم کی طرف آئیں اور ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کا معلوم ایک غیر مسلم کے معلوم سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً ایک مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم خدا کی نازل کی ہوئی سچی کتاب ہے۔ ایک غیر مسلم یہ نہیں جانتا۔ وہ صرف قدرت کے ان حقائق اور قوانین کو ہی جانتا ہے جو وہ قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے معلوم کر سکتا ہے۔ اور ہم اس کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فقط ان ہی حقائق اور قوانین کو بطور دلائل کے پیش کر سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کا یہ طریق نیا نہیں۔ بلکہ یہ طریق بعینہٖ وہی ہے جو خود قرآن حکیم نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم منکرین کو بار بار اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ جہاں ان کو خدا کی ہستی اور صفات کے واضح نشانات نظر آئیں گے اور ایسے حقائق کی بنا پر خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہونے کا دعویٰ ہے جو قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے دریافت کئے جا سکتے ہیں بلکہ قرآن حکیم اس بات کی پیش گوئی کرتا ہے کہ خدا مستقبل میں خارجی دنیا اور نفس انسانی سے متعلق رکھنے والے ایسے حقائق کو آشکار کرے گا جن کی روشنی میں منکرین یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ...

اب یہ بات مسلم ہے کہ سائنس اور سائنسی طریق تحقیق کے معنی مظاہر قدرت کا علم اور اس کے حصول کے طریق کے موجد مسلمان تھے۔ ظہور اسلام کے بعد مسلمان سائنس دانوں کے ذریعہ سے مشاہدہ قدرت کی ضرورت کے بارہ میں قرآن کی راہنمائی سے مستفید ہو کر اب ایک عرصہ سے مغرب کے لوگ مظاہر قدرت کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اب ایسے حقائق کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے جو مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان حقائق کو انہوں نے کئی منظم علوم کی صورت میں مرتب کیا ہے جس کے مجموعہ کو سائنس کہا جاتا ہے۔ قدرت کے جو حقائق مادہ، حیوان اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بالترتیب طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کا نام دیا گیا ہے۔

غیر مسلموں کی کوتاہی

مغرب کے غیر مسلموں نے بے شک مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے بہت سے حقائق کو بڑی احتیاط اور محنت سے دریافت کر کے مختلف علوم کی صورت میں مرتب کر لیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ان حقائق کا حقیقت کائنات کے ساتھ اور لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ حقائق کسی عقلی اور علمی ربط کے بغیر ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب اور مظاہر قدرت کے علم کے متعلق ان کے نقطہ نظر سے متاثر ہونے والی قوموں کے نصب العینوں یا نظریات حیات یا نظام ہائے حکمت کے اندر اس قدر اختلاف موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو یا معلوم درست سمجھا جاتا ہے کہ مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے حقائق جن کو

عام فہم زبان میں سائنسی حقائق کہا جاتا ہے۔ عقلی اور علمی نقطۂ نظر سے حقیقتِ کائنات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور ہر نظامِ حکمت اس کوشش سے عبارت ہوتا ہے کہ حقیقتِ کائنات کے ساتھ ان کے اس تعلق کو جو نظامِ حکمت کے موجد کی سمجھ میں آتا ہے واضح کیا جائے اور استدلال کی قوت سے پایۂ ثبوت کو پہنچایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہر نظامِ حکمت اس کوشش سے صورت پذیر ہوتا ہے کہ سائنسی حقائق کو ان کے علمی اور عقلی ربط و ضبط کے ساتھ منظم کیا جائے۔ ایک نصب العین حقیقتِ کائنات اور اس کے اوصاف و خواص کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ایک نظریہ حیات ایک مجموعہ تصورات ہوتا ہے جو کسی نصب العین سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ عقلی اور علمی لحاظ سے منظم ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک نظامِ حکمت یا فلسفہ ایسے تصورات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو کسی نصب العین کے ماتحت عقلی اور علمی لحاظ سے مربوط اور منظم کئے گئے ہوں۔

فلسفی کا طریق کار

فلسفی کو سب سے پہلے حقیقتِ کائنات کے متعلق ایک وجدان یا ایقان یا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جو اس کے معلوم حقائق پر اس کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے خیال میں ان حقائق سے مطابقت رکھتا ہے۔ پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ حقیقتِ کائنات کے اس وجدانی تصور کے ساتھ معلوم حقائق کے علمی اور عقلی تعلق یا ربط کی وضاحت کرے۔ اس کوشش کے ذریعہ سے وہ دراصل اپنے وجدانی تصورِ حقیقت کی عقلی توجیہہ کرتا ہے اور یہی توجیہہ اس کا فلسفہ کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا وجدانی تصورِ حقیقت غلط ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہہ بھی غلط ہوگی اور اس کے افکار و تصورات کی عقلی ترتیب اور منطقی تنظیم کے اندر جا بجا ناہمواریاں اور نادرستیاں ابھر آئیں گی اور رخنے اور جھول پیدا ہو جائیں گے جن کو وہ یا تو نظر انداز کرے گا یا اپنے دلائل کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرے گا۔ اس قسم کے رخنوں اور جھولوں کا ظہور انسانی اور اجتماعی علوم میں مثلاً نفسیات، فرد و جماعت میں اور سیاسیات، اخلاقیات، اقتصادیات، تعلیمات، قانون اور تاریخ کے فلسفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علوم براہ راست حکماء کے نظریہ حقیقت پر جس میں نظریہ انسانی بھی شامل ہے مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ حکمائے مغرب خود تسلیم کرتے ہیں) مغرب میں نشوونما پانے والے انسانی اور جماعتی علوم میں ایک شدید قسم کا منطقی اور عقلی انتشار پایا جاتا ہے۔ اور جب صورت حال یہ ہو کہ ایک طرف سے انسان کی حقیقت روحانی توجیہہ کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری طرف سے انسانی افکار و خیالات کے مغربی حکماء انسان کی حیوانی اور مادی توجیہہ پر مصر ہوں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مغرب میں پیدا ہونے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں انتشار موجود نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر فلسفی کا وجدانی تصورِ حقیقت درست ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہہ کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام علمی حقائق ازخود اس کے ساتھ ایک درست تنظیم اختیار کر لیں گے اور ایک مکمل نظامِ حکمت کے اندر ایک ایسی مکمل منطقی ترتیب کے ساتھ

آراستہ ہو جائیں گے جس میں کوئی رخنہ یا جھول موجود نہیں ہوگا۔

ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا کام

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ صرف حقیقت کائنات کا صحیح تصور ہی کسی صحیح فلسفہ کی بنیاد ہو سکتا ہے اور ایک فلسفی کے لئے اس کا ہونا یہاں تک ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس کا سارا کام ناقص اور غلط اور بیکار ہو کر رہ جاتا ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفی حقیقت کائنات کا یہ صحیح تصور کہاں سے لائے اور کیسے حاصل کرے۔ خدا نے فلسفی کی اس شدید ضرورت کا سامان کارخانہ فطرت کے اندر بالفعل اور ایک گراں قدر عطیہ کے طور پر خود بخود مرحمت فرمایا ہے اور وہ نبی کامل صاحب قرآن جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور حقیقت ہے جسے آپ کا ہر مخلص پیرو آپ کی محبت اور اطاعت کے ذریعہ سے اپنا سکتا ہے۔ ہمارے تمام اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا اہم کام یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے یہ ثابت کریں کہ کائنات کے طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی ضابطوں سے تعلق رکھنے والے تمام سائنسی حقائق صرف اس وجدانی تصور حقیقت کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں جو قرآن حکیم پیدا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غلط نظام ہائے حکمت یا فلسفے جو غیر مسلم کو اسلام کی طرف آنے سے روکتے رہتے ہیں اور مسلمان محققوں کے اعتقاد کو خاموشی سے سلب کرتے رہتے ہیں شکست ہو جائیں گے۔ سائنسی حقائق کی حمایت اور تائید ان سے ہٹ کر اسلام کے لئے مہیا ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ فلسفے یقیناً فروغ نہیں پائیں گے اور بے اثر اور بے کار ہو جائیں گے اور ان کی بجائے ایک نیا صاف ستھرا صحیح، معقول اور مدلل فلسفہ جو کلیتہً اسلام کا مؤید ہوگا بلکہ جو خود اسلام ہی کی ایک حکیمانہ اور سائنسی تشریح اور تفسیر ہوگا وجود میں آئے گا۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہم دور حاضر کے علم کو قرآن کی روشنی میں اغلاط سے پاک کر سکتے ہیں اور دنیا کے سامنے قطعی طور پر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ صرف قرآن ہی کا عطا کیا ہوا تصور حقیقت صحیح ہے۔ اور یہی ہے وہ طریق جس سے ہم غیر مسلم کو اس کی معلوم اور مسلّم صداقتوں یعنی سائنسی حقیقتوں سے استدلال کر کے اس کی نامعلوم حقائق یعنی قرآن حکیم کی صداقت کے یقین کی طرف لا سکتے ہیں۔ اور شک کرنے والے مسلمان کو کفر اور الحاد سے بچا سکتے ہیں۔ اور پھر یہی ہے وہ طریق جس سے ہم اسلام کی وہ حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ وجود میں لا سکتے ہیں جس کے وجود میں آنے پر اس زمانہ میں ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔

جب اسلام کی سائنسی توجیہہ جو بیک وقت انسان اور کائنات کی سائنسی توجیہہ ہوگی فی الواقع وجود میں آ جائے گی تو وہی ہمارے لئے انسانی اور اجتماعی علوم کی تشکیل جدید کی صحیح اساس مہیا کرے گی۔ وہ ہمیں اس قابل بنا سکے گی کہ ہم مغربی حکماء کی اس کوشش میں کہ تمام انسانی اور اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم بنایا جائے ان کی رہنمائی کر سکیں اس راہنمائی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ کوشش اب تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ اصل بات یہ

ہے کہ جب تک ہمارے تحقیق اسلامی کے ادارے نفسیات فرد اور نفسیات جماعت اور سیاست۔ اخلاق۔ تعلیم۔ فن۔ اقتصادیات۔ قانون اور تاریخ کے فلسفوں کو از سرِ نو اسلام کے تصورِ حقیقت کی بنا پر اور اسلام کی ایک ہی ممکن سائنٹفک توجیہہ کے اجزا اور عناصر کے طور پر مدون اور مرتب نہ کریں۔ یہ کہنا ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ ان کا کام ابتدائی مرحلوں سے کچھ بھی آگے بڑھ سکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ ایک درجن حکما کو کئی سالوں تک مصروف رکھ سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کو جو کام درپیش ہے وہ کتنا وسیع و عریض ہے۔

ایک حیاتیاتی ضرورت

میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام کی حکیمانہ اور سائنٹفک توجیہہ مہیا کرنا مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے جس کو وہ صرف اپنی زندگی کی قیمت ادا کر کے ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ اقدام بہترین مدافعت ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس جنگ کی صورت میں درست ہے جو ایک ریاست کو فوجی محاذ پر لڑنی پڑتی ہے اسی طرح سے اس جنگ کی صورت میں بھی درست ہے جو اس کو نظریاتی محاذ پر لڑنی ہوتی ہے۔ اگر ہم بروقت اور اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے اسلام کی مدافعت کے لئے دوسرے نظریات کے خلاف علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہ کھول سکیں تو ممکن ہے کہ پھر اسلام کی مدافعت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اور ہم دیکھیں کہ جس نظریہ حیات کی مدافعت کے لئے ہم آخر کار باہر نکل رہے ہیں وہ وہ نہیں جس کی مدافعت کے لئے ہمیں کل تک باہر نکلنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ لیکن جب تک ہم اس طریق پر جس کی نشان دہی اوپر کی گئی ہے اسلام کی حکیمانہ اور سائنٹفک توجیہہ پیدا نہ کریں، ہم اس دور میں علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہیں کھول سکتے۔ کام کی فوری ضرورت اور اہمیت کے پیشِ نظر ہمیں اپنے بہترین اور سب سے زیادہ زوردار دماغوں کو اس کام پر لگانا چاہیئے تاکہ یہ بہت جلد اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر پائی جو میسر آ سکتی ہے اس کام پر لگا دیں۔ اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ جب تک کام ختم نہ ہو جائے پوری تندہی کے ساتھ اسی کام میں مصروف رہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مشرقی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق کے کاموں کو کلیتہً بند کر دینا چاہیئے۔ لیکن ہمیں یقیناً مشرقی تحقیق کے کام کو، خواہ ہم آئندہ اس کو کسی نام کے ساتھ جاری رکھنا پسند کریں، یونیورسٹیوں تک محدود کر دینا چاہیئے تاکہ اسلامی تحقیق کے غلط اور فریب کارانہ لقب کے ساتھ جو درحقیقت حیلہ ساز علمیت نواز مستشرق ذہنوں کی پیداوار ہے وہ ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں میں دخل انداز نہ ہو سکے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کا مقام

باقی رہا میکانکی اسلامی تحقیق کا کام سوائے کلیتہً اعلیٰ اصلاحی تحقیق کے کام کی ضرورتوں کے ماتحت رہنا چاہیئے اور فقط ان

فضلا اور علما کی درخواست پر یہی انجام دینا چاہئیے جو اصلی اسلامی تحقیق کے کام میں لگے ہوتے ہوں تاکہ ان کی ضروریات کو جو اس کے کام کے دوران میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں پورا کر سکے۔ البتہ ہم کو میکانکی اسلامی تحقیق کے کام کی طرف اس وقت بھی رجوع کرنا پڑے گا جب ہم اپنی مقدس کتابوں یعنی قرآن اور حدیث کا یا ان کتابوں کا جو ان مقدس کتابوں کی حکیمیاتی یا سائنسی توجیہہ پر مشتمل ہوں گی اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لئے دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے لگیں گے۔ لیکن یہ بات ہماری انتہائی کوتاہ نظری اور ذوق تغافل سے بہی دلستگی کا ثبوت ہوگی کہ ہم ایسے موقع پر بلاضرورت میکانکی اسلامی تحقیق پر اپنا سارا وقت صرف کرتے رہیں جب کہ مقدس کتابوں پر خود ہمارا یقین ہی ختم ہو رہا ہو اس کی مثال ویسی ہے جیسے کہ کوئی شخص ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کے آخری بحرانی لمحوں میں کشتی کو بچانے کی بجائے کشتی کی آنے والی تباہی سے بے پروا ہو کر اس کے مسافروں کی صحیح تعداد اور ان کے کپڑوں کی رنگت اور ساخت کی جزئیات اور تفصیلات کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے بڑی کاوش کرتا رہے یہاں تک کہ کشتی ڈوب جائے۔ قرآن حکیم کا ایک نہایت ہی عمدہ انشادیہ یا میکانکی اسلامی تحقیق کا کوئی ایسا ہی اور نتیجہ اس مسلمان کے لئے کسی کام کا نہیں جو اسلام پر اپنا یقین کھو چکا ہو اگرچہ اسے وجود میں لانے کے لئے سالہا سال کی محنت شاقہ بروئے کار لائی گئی ہو۔

مسلمانوں کی فوری ضرورت

بعض وقت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فوری اور شدید ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے نہ سمجھ لیں ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں اس وقت بھی اسلام ہی کی مختلف توجیہات کی جا رہی ہیں لہٰذا ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس سے ہم نے ایک نیا قانونی نظام اخذ کرنا ہے۔ جب اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ جو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے موجود ہو جائے گی۔ تو پھر وہ نہ صرف غیر مسلموں کے تمام غلط نظریات اور فلسفوں کی عقلی اور ایمانی پروردہ تردید کرے گی بلکہ اسلام کی ان غلط اور بے بنیاد توجیہات کا بھی مکمل اور یقین افروز ابطال کرے گی جو ان مسلمانوں نے پیش کی ہیں جو اسلام کے جدیدیت زدہ، کوتاہ اندیش مسلمان نکتہ چینیوں کو مطمئن کرنے کے لئے اسلام کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں لہٰذا اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ فقط ایک ہی بنیاد ہے جس پر ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ایسی توجیہہ فی الواقع وجود میں آ جائے گی تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام سے متعلق غلطیوں اور غلط فہمیوں کے کھل جانے کی وجہ سے اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کے بہت سے مشکل مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں اور اس کا سارا کام نہایت آسان ہو گیا!

ایک بے وقت کی کوشش

مسلمانوں کی زندگی کے اس مرحلہ پر جب اسلام پر اُن کا یقین گھر رہا ہے اسلام کے قانونی نظام کی تشکیل جدید ایک بے وقت کی کوشش اور ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے موجودہ قوانین بہتر نہیں بلکہ بدتر ہو جائیں گے۔ مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستہ پر راہنمائی کرتی ہے وہ علوم قدیمہ و جدیدہ کا علم ہی نہیں بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور ہے۔ انحطاط دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں تو صعب الحصول ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن نہ ہو۔ نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصہ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ اور ائمہ اور صلحا کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے اسلام کے اخلاقی اور مذہبی ضبط کے ماتحت رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس وقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے۔ اور اس وقت تک ہم ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح سے بدلنا چاہیئے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کے معاشرتی قوانین کم از کم اسلام کے ان اخلاقی اور مذہبی قوانین کی روشنی میں نہیں بدل سکتے جن کی خلاف ورزی ہم دن رات کرتے رہتے ہیں۔

سچا اجتہاد

سچا اجتہاد ہمیشہ اسلام کی گہری محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اُس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لئے ہماری موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت اور ستائش کا نتیجہ ہے اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے اُن خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لئے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل میں چاہتے اور نیز استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کو اس "حکمت" اور "دانائی" سے بہرہ ور کیا جائے جو ہم نے دوسرے نظریات سے سیکھی ہے اور اس طرح سے اسلام کو ایک نئے "حسن و جمال" سے اور ایک نئی "شان و شوکت" سے جن کا نظارہ ہم ان نظریات کی قیادت میں کر چکے ہیں "مزین" کیا جائے۔ یہ سچا اجتہاد نہیں کیونکہ یہ وہ اجتہاد نہیں جو شریعت کی قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے بلکہ یہ شریعت کی تحریف ہے جو ہم اپنے توہمات کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں یا ایک ایسی کوشش ہے جس سے ہم دوسرے نظریات کو جنہیں ہم پسند کرتے ہیں جہاں تک ہمارا بس چل سکتا ہے اسلام کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ سچا اجتہاد اس وقت ممکن ہوگا جب ہم

اسلام سے پھر ایسی ہی محبت کا احساس کرنے لگیں گے جیسی کہ پہلے ہمارے دلوں میں تھی اور ہم اُس شریعت کو جس پر حضور اور صحابہ کا عمل تھا پھر اس محبت کی روشنی میں پوری طرح سے سمجھنے لگیں گے۔ جب تک ہمیں اسلام کی محبت کا یہ مقام پھر حاصل نہیں ہو جاتا ہم اسلام کی اس بصیرت سے محروم رہیں گے جس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ آیا ہمارے معاشرہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے یا نہیں کہ ہم شریعت کی روشنی میں اس کی اصلاح کے لئے نئے قوانین وضع کریں۔ اگر حضرت عمرؓ کو یہ بصیرت حاصل تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ عام بے یقینی کے اس دور میں یہ بصیرت ہمیں بھی حاصل ہے۔

ہمارے معاشرہ کے موجودہ حالات درحقیقت کس چیز کے مقتضی ہیں

جس چیز کو ہم معاشرہ کا ایک

ناگزیر ارتقائی تغیر سمجھ رہے ہیں جو ہمارے خیال میں اجتہاد اور نئے قوانین کا تقاضا کرتا ہے وہ درحقیقت مغرب کی تقلید میں ہماری عام انحطاطی گراوٹ۔ غیر اسلامی نظریات سے ہماری محبت اور اسلام کے اخلاقی اور دینی ضبط اور نظم سے ہماری نفرت اور بغاوت کے عوامل ہیں جو ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کر رہے ہیں۔ یہ تمام حالات اسلام پر ہمارے یقین کے انحطاط کی علامات کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔ موجودہ صورت میں ہمارا اجتہاد جو باطل ہوگا ان افسوسناک حالات کو بہتر نہیں بلکہ بدتر بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اجتہاد شریعت کے وقار کو اور اس کے ساتھ پورے اسلام کے وقار کو اور کم کرے گا جس سے ہمارا یقین اور مضمحل ہو جائے گا اور ہم میں سے بعض لوگ جن کا ایمان پہلے ہی کمزور ہے ناحق اور ناروا طور پر یہ سمجھنے لگیں گے کہ اسلام ایک وقتی نظریہ حیات ہے جو حالات کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ لیکن اسلام کی ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ ایسے اجتہاد کو سچے مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کیا اور اس کے باوجود سچا اسلام ہمیشہ زندہ اور باقی رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے کہا ہے کہ یقین و ایمان کے انحطاط کے اس دور میں متقدمین کے نقش قدم پر چلنا اس سے بدرجہا بہتر اور محفوظ تر ہے کہ ایسے لوگوں کا اجتہاد قبول کیا جائے جو نورِ ایمان سے محروم ہو چکے ہوں۔ ان حالات کا صحیح علاج یہ نہیں کہ ہم نئے قوانین وضع کریں جو ہمارے اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور سطحی طور پر بدل سکتے ہیں بلکہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ ہم اسلام کے جدید نظام تعلیم کو نافذ کریں جس میں خدا کا تصور تمام طبیعیاتی حیاتیاتی اور نفسیاتی یا انسانی اور اجتماعی علوم کو منظم کرنے والا محوری اور مرکزی تصور ہو۔ صرف ایسا نظام تعلیم ہی فرد کو ذہنی طور پر پوری طرح سے بدل کر درست کر سکتا ہے۔ یہ نہ تو کوئی دیانت داری ہے اور نہ انصاف کہ ہم پہلے خود ہی ایک ایسا تعلیمی اور ثقافتی ماحول پیدا کریں جس میں فرد کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت صرف اس طرح سے ہو سکے کہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے اور پھر یہ شکایت کریں کہ اس طرح کے اعمال و افکار درست نہیں۔ اور ایسے

قوانین وضع کریں جو اس کے نا درست اعمال میں ایک بیرونی مصنوعی دباؤ کی صورت میں رکاوٹ پیدا کریں۔ قوانین صرف وہاں کام کرنے کے لیے وضع کئے جاتے ہیں جہاں تعلیم ناکام ہوگئی ہو۔ ہمارے لئے اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ ہم تعلیم کی اصلی دلوں کو بدلنے والی قوت کو آزمانے کے بغیر قوانین کی مصنوعی قوت سے کام لیں۔ جو ہمارے ظاہری اعمال کو بھی بدل نہیں سکتی۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہم معاشرہ کو جدید اسلامی نظام تعلیم کے ذریعے حقیقی معنوں میں اور بنیادی طور پر بدلنے کی بجائے اُسے مصنوعی اور سطحی طور پر بدلنے کے لئے موجودہ اسلامی قوانین کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب قوانین پر عمل کرنے کی نیت موجود نہ ہو تو اُن کی زد سے بچ کر نہایت آسانی کے ساتھ اُن کی خلاف ورزیاں کی جا سکتی ہیں۔

لیکن جدید اسلامی نظام تعلیم جو نہ صرف اسلامی ہونا چاہیئے بلکہ علمی اور عقلی لحاظ سے بھی محکم اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہونا چاہیئے اس بات پر موقوف ہے کہ آیا ہم تعلیم کا کوئی معقول اور صحیح فلسفہ جو لازماً اسلامی ہوگا پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں اور تعلیم کا ایسا فلسفہ انسان اور کائنات کی صحیح علمی اور عقلی توجیہہ دوسرے لفظوں میں اسلام کی سائنسی اور حکمیاتی توجیہہ کے ایک جزو کے طور پر ہی وجود میں آ سکتا ہے ورنہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی یہی سائنسی حکمیاتی توجیہہ ہے جو اسلامی نظام قوانین کی ایک ہی ممکن بنیاد بھی ہے۔ غرض ہم جس نقطہ نظر سے بھی دیکھیں، ہماری فوری ضرورت یہ نہیں کہ ہم اسلام کے قوانین کو بدل دیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اصلی اور صحیح قسم کی اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ پیدا کر کے اسلام پر اپنے ایمان کو تازہ کریں اور اسلام کی صحیح علمی اور عقلی واقفیت سے اپنے آپ کو مسلح کریں تاکہ محض عالمِ انسانی [illegible] کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے جس نظریاتی جنگ میں ہم مجبوراً شریک ہیں اس میں فتح پائیں۔ اور شکست [illegible] مٹنے سے محفوظ رہیں۔

ہم سے طلب فرمایئے

تحقیق مزید

بہ سلسلہ خلافت معاویہ رضؓ و یزید رح

مؤلفہ : علامہ سید محمود احمد عباسی

بڑی تقطیع، صفحات ۵۰۴، مجلد : قیمت آٹھ روپے (محصول ڈاک اس کے علاوہ)

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوتھر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

صفحہ ۲۲۵

ہم سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا فراہیؒ

تفاسیر

التکمیل فی اصول التاویل (عربی) سائز ۲۰×۲۶/۸
صفحات ۲۰، طباعت ٹائپ : قیمت ۳،۵۰ روپے

دلائل النظام (عربی) سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۳۲
طباعت ٹائپ، کاغذ عمدہ سفید : قیمت: ۴،۵۰ "

مقدمہ تفسیر نظام القرآن (اردو ترجمہ)		"	۰،۹۰ "
تفسیر بسم اللہ و سورہ فاتحہ "		"	۰،۴۵ "
" سورۂ قیامہ	"	"	۰،۶۰ "
" " والشمس	"	"	۰،۵۰ "
" " فیل	"	"	۱،۰۰ "
" " زاریات	"	"	۱،۳۰ "
" " مرسلات	"	"	۰،۶۰ "
" " والتین	"	"	۰،۷۰ "
" " کوثر	"	"	۱،۱۰ "
" " لہب	"	"	۰،۷۰ "
تحریم	"	"	۰،۷۰ "
" " عبس	"	"	۰،۷۰ "
" والعصر	"	"	۰،۶۰ "
" " کافرون	"	"	۰،۴۵ "
" " اخلاص	"	"	۰،۴۵ "
اقسام القرآن	"	"	۱،۳۰ "
ذبیح کون ہے؟	"	"	۱،۷۰ "

لغت و ادب

اسباق النحو

حصہ اول : ۱،۴۰ روپیہ

حصہ دوم ۱،۰۰ "

•

امثال آصف الحکیم

قیمت : ۱،۳۵

•

جمہرۃ البلاغہ

قیمت : ۱،۵۰ "

•

مفردات القرآن

قیمت : ۱،۴۰ "

•

دیوان عربی

قیمت : ۱،۵۰ "

•

نوائے پہلوی

(دیوان فارسی)

قیمت : ۴،۰۰ "

☆

دارالاشاعت الاسلامیہ اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور ـا

فون نمبر ۶۶۵۲۲

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت

سائنس کیا ہے؟ علم کے جس شعبہ کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا دوسرا نام علم کائنات ہے۔ جس میں انسان کا علم بھی شامل ہے۔ سائنسی علوم کی کلید کائنات کے قدرتی حالات اور واقعات کا یا دوسرے لفظوں میں مظاہر قدرت کا مشاہدہ ہے جو ہمارے حواس خمسہ کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے۔ سائنسدان کائنات کے مشاہدہ سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے۔ پھر ان نتائج کو ایک قابل فہم تنظیم اور ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ ہر درست سائنسی نتیجہ کو ہم ایک مستقل علمی حقیقت یا قانون قدرت سمجھتے ہیں۔ مشاہدہ سے دریافت ہونے والے نتائج یا علمی حقائق کو جب مرتب اور منظم کر لیا جاتا ہے تو اسے ہم سائنس کہتے ہیں۔

سائنسی طریق تحقیق کے چار مرحلے بعض وقت سائنسداں کائنات کے حالات اور واقعات کا مشاہدہ براہ راست ان کی قدرتی حالت میں کرتا ہے اور اس غرض کیلئے انکو ڈھونڈنکالتا ہے اور خود ان کے قریب جاتا ہے۔ لیکن بعض وقت وہ اپنے معمل کے اندر کائنات کے حالات اور واقعات کو مصنوعی طور پر پیدا کر کے ان کا مشاہدہ کرتا ہے گویا ان کو اپنے قریب لاتا ہے لیکن خواہ سائنسداں مظاہر قدرت کے قریب خود جائے یا ان کو اپنے قریب لائے دونوں صورتوں میں وہ کائنات کے مشاہدہ اور مطالعہ کی خاطر اپنے لئے سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ سائنسدان کی اس کوشش کو تجربہ کا نام دیا جاتا ہے۔ تجربہ کی غرض مشاہدہ ہے اور مشاہدہ کی غرض غور و فکر کے بعد نتائج اخذ کرنا۔ بعض وقت بہت سے الگ تھلگ سائنسی حقائق مل کر ایک ایسی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں جو براہ راست تجربہ اور مشاہدہ کے طریقوں سے ثابت شدہ نہیں ہوتی۔ تاہم چونکہ وہ بعض ثابت شدہ حقائق کو منظم کرتی ہے۔ اس لئے سائنسدان اسے ایک قابل یقین نظریہ کے طور اپنے سائنسی حقائق میں داخل کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کے بغیر اس کے الگ تھلگ سائنسی حقائق قابل فہم نہیں ہوتے اور ان میں کوئی منطقی تنظیم یا وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہذا یہ نظریہ بھی جب تک کہ سائنسی حقائق اسے غلط ثابت نہ کریں ایک سائنسی حقیقت کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ وہ بھی ہمارے مشاہدات کے نتائج میں شامل ہوتا ہے۔

صفحہ ۶۱

سائنسدان کے اس طریق تحقیق کو جس کی روح کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ ہے۔ سائنسی طریق تحقیق — یا سائنٹیفک میتھڈ (SCIENTIFIC METHOD) کہا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ سائنسدان کے طریق تحقیق کے چار مرحلے ہوتے ہیں۔

اوّل :- تجربہ EXPERIMENT

دوئم :- مشاہدہ OBSERVATION

سوئم :- اخذ نتائج INFERENCE

چہارم :- تنظیم نتائج SYSTEMATIZATION OF INFERENCE

سائنسی علوم کی قسمیں کائنات کے تین واضح طبقے ہیں (۱) مادہ (۲) زندہ اجسام اور (۳) نفس انسانی اور ان کے بالمقابل علم کائنات یا سائنس کے بھی تین بڑے حصے ہیں۔

(۱) مادہ کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا طبعیاتی علوم جن میں علم طبعیات، علم کیمیا، علم الافلاک، علم الارض وغیرہ علوم شامل ہیں۔

(۲) زندگی کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا حیاتیاتی علوم جن میں علم حیاتیات، علم نباتات، علم الحیوانات علم الجنین، علم الابدان، طب وغیرہ علوم شامل ہیں۔

(۳) نفس انسانی کی ماہیت اور اس کے مظاہر سے تعلق رکھنے والے علوم یا انسانی یا نفسیاتی علوم جن میں نفسیاتِ فرد، نفسیات جماعت، علم التاریخ، علم السیاست، علم الاخلاق، علم الاقتصاد، علم القانون، علم التعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ریاضیات اور منطق بھی نفسیات ہی کی شاخیں ہیں۔ کیونکہ وہ ان اصولوں کی تشریح اور تفصیل پر مشتمل ہیں جن کے مطابق ذہن انسانی سوچتا ہے۔

ہم سائنس کے ان شعبوں کو اختصار کی غرض سے اعلیٰ الترتیب، طبعیات اور حیاتیات اور نفسیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

سائنسداں کے بنیادی اعتقادات بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنس کو اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں اور دور حاضر کا سائنسداں اپنی تحقیق کسی ایسے اعتقاد سے شروع نہیں کرتا جس کو اس نے بلا ثبوت پہلے سے قبول کر لیا ہو۔ بلکہ وہ خالی الذہن ہوتا ہے اور اس کے مشاہدات جس طرف اسے لے جاتے ہیں چلا جاتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ ہر سائنسدان اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد کے طور پر حقیقت سائنس یا حقیقت علم کے متعلق کچھ عقائد رکھتا ہے جو خود حقیقت کائنات کے کسی عقیدہ سے ماخوذ ہوتے ہیں اور جو اس کی تحقیق کے نتائج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر سائنسداں شروع سے ہی اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے

کہ کائنات ایک یکساں کل یا وحدت ہے۔ یعنی وہ فاصلہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے ایسے منطقوں یا حصوں میں بٹی ہوئی نہیں جن میں متضاد قسم کے قوانین قدرت جاری ہوں۔ کائنات کے قوانین مسلسل اور مستقل ہیں وہ نہ صرف ہر جگہ ایک ہی ہیں بلکہ ہر زمانہ میں بھی ایک ہی رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سائنسداں کا یہ عقیدہ صحیح ہے اور اس کی صحت کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ آج تک غلط ثابت نہیں ہو سکا۔ یہ عقیدہ سائنسی تحقیق کا باعث ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں۔ سائنس کی تمام ترقیات جو اب تک ممکن ہوئی ہیں۔ ان کی بنیاد یہی عقیدہ ہے۔ اگر سائنسداں اس عقیدہ سے آغاز نہ کرتے اور یہ عقیدہ صحیح نہ ہوتا تو سائنس ممکن ہی نہ ہوتی۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو سائنسداں کو سائنسی تحقیق کے لئے اکساتا ہے اور اسی کی تصدیق سے وہ اپنے سائنسی نتائج پر مطمئن ہوتا ہے۔ اور اس کی راہ پر آگے قدم اٹھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنسداں کو معلوم ہو جائے کہ جو سائنسی حقیقت اس نے اپنی تحقیق سے آج اس وقت اور اس مقام پر دریافت کی ہے وہ محض وقتی اور مقامی ہے اور اس کی متبادل یا متوازی سائنسی حقیقتیں اس کائنات میں بہت سی ہیں۔ یا آئندہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اگر اسے یہ خیال ہو کہ پانی سطح سمندر سے یکساں بلندی پر کہیں تو سو درجہ حرارت پر اور کہیں پچاسی درجۂ حرارت پر ابلتا ہے اور کسی خاص مقام پر کسی وقت ۱۰۰ درجہ حرارت پر اور کسی اور وقت پچاس درجہ حرارت پر ابلتا ہے تو وہ اپنی اس تحقیق کے نتیجہ کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دے گا۔

کائنات کی وحدت کے نتائج پھر کائنات کی اسی وحدت کی وجہ سے سائنسداں بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ سائنس ایک وحدت ہے اور تمام سچے سائنسی حقائق خواہ وہ طبیعاتی ہوں یا حیاتیاتی یا نفسیاتی ایک دوسرے کے ساتھ عقلی طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ علمی ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ایک دوسرے کی تائید اور توثیق کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر روشنی ڈالتے ہیں اور کسی صورت میں بھی آپس میں ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہوتے اور ایک دوسرے کی علمی اور عقلی مخالفت نہیں کرتے۔ سائنسداں بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تمام سائنسی حقائق مل کر ایک ایسا عقلی اور علمی نظام بناتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی نام نہاد "سائنسی حقیقت" اس میں داخل کر دی جائے جو سچی سائنسی حقیقت نہ ہو تو وہ اس نظام میں سما نہیں سکتی کیونکہ تمام سائنسی حقائق اس کی علمی اور عقلی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی اعتقاد کی وجہ سے جب سائنسداں دیکھتا ہے کہ اس کی تحقیق کے ذریعہ سے کوئی ایسی سائنسی حقیقت آشکار ہوئی ہے۔ جو کسی دوسری سائنسی حقیقت سے جو پہلے سے معلوم اور مسلم ہو ٹکراتی ہے تو وہ اپنی تحقیق کو ناقص سمجھتا ہے اور اس "نام نہاد" سائنسی حقیقت کو غلط سمجھ کر رد کر دیتا ہے یا پھر پہلی معلوم اور مسلم سائنسی حقیقت پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ اس پر نظر ثانی کرتا ہے اور اگر وہ غلط ہو تو اسے رد کر دیتا ہے۔ سائنسی حقائق کی وحدت

کا نتیجہ یہ ہے کہ جب سائنس کا کوئی حصہ غلط طور پر ترقی کر رہا ہو تو ساری سائنس کی ترقی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ سائنس کے بعض حصوں کی ترقی بالکل رک جاتی ہے۔ سائنسداں بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ہر سچی سائنس بہت سی اور سائنسی حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اگر اس نے ایک ایسی حقیقت کو رد کر دیا تو بہت سی اور سائنسی حقیقتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ اور سائنس کی ترقی اس کے کسی نہ کسی شعبہ یا حصہ میں رک جائے گی۔ یہ وہ اعتقادات ہیں جن سے سائنسدان اپنی تحقیق کا آغاز کرتا ہے۔ یہ اعتقادات اس کی تحقیق کے آغاز سے پہلے اس کے دل کے اندر بطور مسلمات کے موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ثابت نہیں کرتا بلکہ قبول کرتا ہے اور ان کی مدد سے اور ان کی روشنی میں اپنے تمام سائنسی حقائق کو ثابت کرتا ہے۔

سائنس کی وحدت کا سبب حقیقت کائنات کی وحدت ہے

سائنسداں وحدت کائنات اور وحدت سائنس پر بلا ثبوت اور بلا دلیل اعتقاد کیوں رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بحیثیت انسان اپنی فطرت سے ایسا کرنے کے لئے مجبور ہے۔ انسان کی فطرت کے اندر یہ اعتقاد ودیعت کیا گیا ہے کہ حقیقت کائنات ایک ہے اور ساری کائنات اسی کا مظہر ہے اور خواہ سائنسداں اپنے اس وجدانی اعتقاد کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ لیکن یہ اعتقاد پھر بھی اس کی فطرت کے جزو لاینفک کے طور پر اس کے لاشعور میں جاگزیں رہتا ہے اور وہ اس اعتقاد کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے جب تک حقیقت کائنات کو شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نہ مانا جائے سائنسی حقائق کی وحدت کو ماننا ممکن نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت بغیر نظم یا اتحاد کے نہیں ہوتی اور نظم متحد کرنے والے یا منظم کرنے والے کسی مرکزی اصول کے بغیر محال ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ جو اصول تمام سائنسی حقائق کو متحد اور منظم کرے۔ وہ ان کی جان یا روح یا آخری حقیقت کے طور پر ہو۔ یعنی وہ حقیقت الحقائق یعنی کائنات کی آخری حقیقت ہو اور تمام سائنسی حقائق اس کی تشریح اور تفسیر کے اجزا اور عناصر ہوں اور اس کے ساتھ علمی ربط اور عقلی مطابقت رکھتے ہوں۔ دراصل سائنسی حقائق کے باہمی علمی اور عقلی ربط و ضبط کی وجہ یہی ہے کہ وہ سب حقیقت کائنات کے ساتھ عقلی اور علمی ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ سائنسداں کا شعوری یا لاشعوری تصور حقیقت ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے سائنسی نتائج پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور چونکہ سائنسی حقائق صرف صحیح تصور حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور کسی غلط تصور حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتے۔ لہٰذا اگر سائنسداں کا تصور حقیقت درست ہوگا تو اس کی سائنسی تحقیق

درست ہوگی اور اس کو درست نتائج تک پہنچائے گی۔ ورنہ جا بجا غلط ہو جائے گی اور آخر کار رُک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت نفسیاتی یا سائنسی علوم کے دائرہ میں جو تصور حقیقت کے ساتھ زیادہ قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔ زیادہ شدت سے نمودار ہوگی۔ تصور حقیقت کے غلط ہونے سے سائنس کے غلط ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سائنسدان غیر شعوری طور پر بعض صحیح سائنسی حقائق کو بدل کر اپنے غلط تصوّر حقیقت کے مطابق کرتا جاتا ہے اور بعض غلط نام نہاد "سائنسی حقائق" کو جو اس کے مطابق ہوں صحیح سمجھ کر قبول کرتا جاتا ہے۔

فلسفہ کا کام یہ ہے کہ وہ آشکار طور پر کسی تصور حقیقت کو پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ تمام سائنسی حقائق کی عقلی اور علمی مطابقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فلسفیوں نے صحیح تصور حقیقت کے مختلف نظریات قائم کئے ہیں اور قدرتی طور پر ہر فلسفی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تمام سائنسی حقائق صرف اسی کے تصور حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں لہذا اسی کا تصور حقیقت صحیح ہے لیکن چونکہ صرف ایک ہی تصور حقیقت تمام سائنسی حقائق کو متحد اور منظم کر سکتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ درست تصور حقیقت صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا تصور حقیقت روسی اشتراکیوں کے نزدیک یہ تصوّر حقیقت مادہ ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک یہ تصور حقیقت خدا ہے۔ لہذا مسلمانوں کے نزدیک یہی تصوّر حقیقت ہے جس سے تمام سائنسی حقائق مطابقت رکھتے ہیں اور جو تمام سائنسی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور ان کی طرف صحیح راہ نمائی کرتا ہے۔ باقی ہر قسم کے تصورات حقیقت سائنس کی مجموعی ترقی مضر ہیں۔ دراصل ایک ہی تصور حقیقت ایسا ہے جو وحدت عالم اور وحدت علم کی معقول اور قابل قبول تشریح کر سکتا ہے اور وہ مسلمانوں کا تصور حقیقت ہے جس کی رو سے وہ یہ مانتے ہیں کہ سائنسی حقائق اور قوانین قدرت کی حقیقت اور اصلیت یہ ہے کہ وہ کائنات میں خدا کے تخلیقی اور تربیتی اعمال و افعال ہیں اور خدا ایک شخصیت ہے اور شخصیت کا خاصہ ہے کہ اس کا صرف ایک مقصد یا مدعا ہوتا ہے۔ جس کے ماتحت اس کے سارے اعمال و افعال سرزد ہوتے ہیں۔ جہاں بھی ہمیں اعمال اور افعال کا ایک منظم سلسلہ نظر آئے وہاں کسی شخصیت کی کارفرمائی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ فرد انسانی کے اعمال و افعال کے اندر بھی ایک وحدت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک شخصیت ہے اور بیک وقت ہمیشہ ایک مقصد اور مدعا کے ماتحت اپنے سارے کام کرتا ہے۔

چونکہ کائنات کی تخلیق سے خدا کا ایک مقصد ہے لہذا خدا کے سارے اعمال و افعال میں جو قوانین

قدرت یا سائنسی حقائق کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ایک وحدت موجود ہے۔ اس کے برعکس چونکہ قوانین قدرت یا کائنات کے اعمال و افعال کے اندر ایک وحدت موجود ہے لہذا ضروری ہے کہ ان اعمال و افعال کا باعث کوئی شخصیت ہو جو کائنات کی خالق ہو۔

وحدت کائنات سے خدا کے وجود کا قرآنی استشہاد

وحدت کائنات کا باعث یہ ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور وہ مقصد ایک ہی ہے اور اس کے مقصد کی وحدت کا باعث یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور وہ خالق ایک ہی ہے۔ وحدت کائنات پر سائنسدانوں کے غیر شعوری وجدانی اعتقاد کا باعث ان کی فطرت کا یہ مخفی اور غیر شعوری تقاضا ہے کہ وہ کائنات کا ایک مقصد مانیں اور وہ مقصد ایک ہی ہو اور اس کا ایک خالق تسلیم کریں اور وہ خالق ایک ہی ہو۔

قرآن حکیم نے کائنات کی وحدت کی طرف پرزور الفاظ میں توجہ دلائی ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے اور وہ خالق ایک ہی ہے۔

ما ترى فى خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر هل ترى من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئاً وهو حسير (آیت ۲ پ ۲۹)

اے پیغمبر آپ خدا کی تخلیق میں کوئی فرق نہ دیکھیں گے ذرا نظر دوڑائیے اور کائنات کا مشاہدہ کیجئے کیا آپ کو خدا کی اس تخلیق میں کبھی کوئی دراڑ نظر آتا ہے۔ پھر دوبارہ نظر دوڑائیے اور دیکھئے۔ نگاہیں مایوس اور درماندہ لوٹیں گی کہ خدا کی تخلیق میں کبھی کوئی دراڑ نہیں ایک کائنات کی یہ وحدت اس کی مقصدیت کا اور پھر اس کی مقصدیت کسی خالق کائنات کی ہستی اور وحدت کا ثبوت نہیں؟

قل ارايتم ما تدعون من دون الله اروني ماذا خلقوا من الارض ام لهم شرك فى السموٰت (آیت ۳۔ پ ۲۶)

اے پیغمبر کہئے کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر کس کی عبادت کرتے ہو مجھے بتاؤ تو سہی کہ آیا انہوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں انکا کوئی حصہ ہے

یعنی اگر کائنات کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کوئی اور شریک ہوتا تو زمین و آسمان میں کہیں تو اس کی اپنی تخلیق کا کوئی نشان ملتا جہاں جدا قسم کے قوانین قدرت نافذ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ منکرین قرآن حکیم کے اس سوال کے جواب میں اسی کائنات کا ایک حصہ پیش کر کے معقولیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ حصہ خدا کے اس شریک نے پیدا کیا ہے جسے ہم مانتے ہیں۔ کیونکہ جب کائنات کے اس حصہ میں بھی قوانین قدرت

وہی ہیں جو باقی کائنات میں ہیں۔ تو کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا خالق وہی نہیں۔ جو باقی کائنات کا ہے

فلسفہ سائنس کا ہی ایک شعبہ ہے

فلسفہ اور سائنس کے اس باہمی تعلق کی بنا پر ہم فلسفہ کو سائنس سے الگ نہیں کر سکتے۔ جب تک سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دریافت کئے ہوئے حقائق کی تشریح، توجیہہ یا تنظیم کے لئے نظریات قائم کرے فلسفہ اور سائنس میں کوئی واضح امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ پوری کائنات کی سائنسی تحقیق کی وہ چوتھی اور آخری منزل ہے جہاں تمام کائنات کا سائنسی علم، تجربہ اور مشاہدہ اور تحقیق کے تینوں مرحلوں سے گذر کر تنظیم نتائج کے چوتھے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے۔ دراصل جب سائنسی تحقیق اپنی مجموعی حیثیت سے اپنے آخری درجہ پر پہنچتی ہے تو ہم اسے فلسفہ کہتے ہیں۔

مسلمان سائنسی طریق کے موجد اور سائنسی علوم کے بانی تھے۔

بعض یورپی مصنفوں کی غلط بیانیوں کی وجہ سے دنیا مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہے کہ سائنسی علوم اور سائنسی طریق تحقیق کے موجد یورپ کے لوگ ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ سائنسی طریق تحقیق کا موجد روجر بیکن (ROGER BACON) یا اس کا ایک اور ہم نام ہے لیکن علوم کی تاریخ کے موضوع پر حال کی علمی تحقیق نے اس ناقابل تردید تاریخی حقیقت سے پردہ چاک کر دیا ہے کہ سائنسی طریق تحقیق جس کی بدولت موجودہ سائنسی علوم کی بنیاد پڑی مسلمانوں نے رکھی تھی۔ پھر بعض لوگوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق یونانیوں سے سیکھا تھا اور اپنے سائنسی علوم کی بنیاد یونانیوں کی سائنس پر رکھی تھی۔ لیکن یہ خیال بھی درست نہیں۔

تعمیر انسانیت (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف برفالٹ BRIFFAULT اس قسم کی تمام غلط فہمیوں کی پرزور تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"عصر جدید کی دنیا میں عربوں کی تہذیب کا عظیم الشان حصہ سائنس ہے۔ لیکن اس کے پھیل کو پکنے میں کچھ دیر لگی۔ جب تک ہسپانوی عربوں کی تہذیب تاریکی میں دوبارہ گم نہیں ہوئی۔ وہ دیو مہیب جس کو اس نے جنم دیا تھا۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا۔ یہ فقط سائنس ہی نہیں تھی۔ جس نے یورپ کو زندہ کیا۔ اسلام کی تہذیب کے اور بہت سے اثرات نے یورپ کی زندگی کو اس کی پہلی چمک دمک سے آراستہ کیا۔" ص: ۲۰۲

"اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثر کے نشانات

موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا کہ اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یعنی سائنس اور سائنسی طرزِ فکر۔" ص : ۱۰۹

"ہماری سائنس فقط انقلاب آفرین نظریات کی حیرت انگیز دریافت کے لئے ہی علوم عرب کی احسان مند نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی بڑے احسان کے لئے عربوں کی تہذیب کی مرہون منت ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے وجود ہی کے لئے اس کے زیر احسان ہے۔ دنیائے قدیم یعنی یونانیوں کی تہذیب جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، سائنس سے پہلے کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات اور ریاضیات دوسرے ملکوں سے درآمد کی ہوئی چیزیں تھیں۔ جن کو یونانی تہذیب کی آب و ہوا کبھی پوری طرح سازگار نہ آسکی۔ اہل یونان حقائق کو منظم کرتے تھے۔ ان سے عمومی نتائج اور اصول اخذ کرتے تھے اور نظریات قائم کرتے تھے۔ لیکن تحقیق و تجسس کے صبر آزما راستے، مثبت علم کی فراہمی، سائنس کے نقطہ رس طریقے، مفصل اور طویل مشاہدہ اور تجرباتی چھان بین ایسی چیزوں کا اہل یونان کی افتادِ طبیعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ قدیم کلاسیکی دنیا کا علمی کام اگر کسی مقام پر ذرا سا بھی سائنسی تحقیق کے نزدیک پہنچا تو وہ یونانیوں کے دور کا اسکندریہ تھا جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تحقیق کی ایک ایسی نئی روح اور تجسس کے ایسے نئے طریقوں یعنی تجربہ، مشاہدہ اور پیمائش اور ریاضیات کی اس قسم کی ترقی کے طفیل ظہور پذیر ہوئی تھی۔ جس سے اہل یونان محض بے خبر تھے۔ اس روح کو اور ان طریقوں کو یورپ میں عربوں نے داخل کیا۔" ص : ۱۰۹

"یورپ میں علوم کا احیاء پندرھویں صدی میں نہیں بلکہ اس وقت ہوا جب عربوں اور موروں کی تہذیب کے اثر سے یورپی تہذیب میں زندگی کی نئی روح پھونکی گئی۔ یورپ کی نئی زندگی کا گہوارہ اٹلی نہیں، بلکہ اسپین تھا۔ مدتوں تک بربریت کی پستیوں میں غرق ہوتے رہنے کے بعد یورپ جہالت اور ذلت کی تاریک ترین گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا جب عرب ملکوں کے شہر بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور طلیطلہ تہذیب اور علمی مشاغل کے ترقی پذیر مراکز بنے ہوئے تھے ان شہروں میں اس نئی زندگی کا آغاز ہوا جو نوع انسانی کے ارتقاء کے ایک نئے پہلو کی صورت میں جلوہ افروز ہونے والی تھی۔ اس وقت سے کہ جب عربوں کی تہذیب کا اثر محسوس ہونے لگا۔ نئی زندگی حرکت میں آنے لگی۔" ص : ۱۸۸

لیکن وہ نقطۂ نظر جس کی روشنی میں عرب موجودہ مواد کو کام میں لاتے تھے۔ یونانیوں

کے نقطہ نظر کے بالکل متضاد تھا یہ نقطۂ نظر بعینہٖ وہ چیز مہیا کرتا تھا جس کا فقدان یونانیوں کے ذہن کا کمزور اور ناقص پہلو تھا۔ یونانیوں کی دلچسپی کا مرکز نظریہ آفرینی اور اصول سازی تھے۔ وہ ٹھوس مشاہداتی حقائق سے بے پرواہ تھے اور ان کو نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے برعکس عرب محققین کا ذوق دریافت نظریہ آفرینی سے بے پروا تھا اور اس کا مقصود ٹھوس حقائق کو بہم پہنچانا اور اپنی معلومات کو صحت اور کمیت کے معیاروں پر لانا تھا۔ معتبر اور پائیدار سائنس اور ڈھیلے ڈھالے سائنسی ذوق میں جو چیز فرق پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کہنے والا کیفیت نہیں بلکہ کمیت بیان کر رہا ہے اور اپنی پیمائش کو ہر ممکن طریق سے درست کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ عربوں کا سارا وسیع و عریض سائنسی کام اسی معروضی تحقیق اور کمیتی صحت و صفائی کے ذوق کے زیر اثر انجام پاتا رہتا ہے۔ روجر بیکن نے آکسفورڈ اسکول میں ان لوگوں کے جانشینوں کے ماتحت عربی زبان اور عربی سائنس کا علم حاصل کیا تھا نہ روجر بیکن اور نہ ہی اس کا دوسرا ہم نام اس بات کا اہل ہے کہ اسے سائنسی طریق تحقیق کے موجد ہونے کا اعزاز بخشا جائے، روجر بیکن تو محض عیسائی یورپ کے لئے مسلمانوں کی سائنس کے سفیروں یا پیام رسانوں میں سے ایک تھا اور وہ کبھی یہ کہتے ہوئے نہ تھکتا تھا کہ عربی زبان اور عربی سائنس کا سیکھنا اس کے ہم عصروں کے لئے سچے علم کا ایک ہی راستہ ہے۔ یہ بحثیں کہ سائنسی طریق تحقیق کا موجد کون تھا یورپی تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں ایک بہت بڑی غلط بیانی پر مشتمل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بیکن سے پہلے عربی کا تجرباتی طریق تحقیق عام ہو چکا تھا اور یورپ بھر میں اس کا تتبع نہایت ذوق و شوق سے کیا جاتا تھا۔" (جاری)

بقیہ افکار و آراء

کے بنیادی مقاصد حفاظت اور اسلام کی برتری کے لئے باہم متفق و متحد ہو جائیں جس سے ایک دفعہ پھر دنیا میں "بیان" مرصوص" کا نقشہ سامنے آجائے۔ اور جس سے واضح ہو جائے کہ ابھی اسلام کے جاں نثار شیدائی زندہ ہیں۔

آپ کی اس مخلصانہ قربانی سے بعونہٖ تعالیٰ اسلام میں نشاۃ ثانیہ کا مبارک دور شروع ہو جائے گا ممالک اسلامیہ کی نگاہیں پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ نظریہ قیام پاکستان کی تکمیل سے ہی تحریک اتحاد عالم اسلام کی تکمیل بآسانی ہو سکتی ہے اور اس عظیم تعمیری تحریک سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسلام کے پیغام امن کی فتح مبین ہوگی۔ (بکرمہ تعالیٰ)

اس سلسلہ میں التماس ہے کہ تمام جماعتوں کے ذمہ دار ارکان فوری طور پر ایک باہمی مشاورتی اجلاس بلائیں جس میں ایک مجلس عمل منتخب ہو۔ یہ مجلس باہمی غور و فکر سے مناسب لائحہ عمل مرتب کرے۔ (واللہ المستعان)

آپ کا ادنیٰ (رضا کار (محمد ذاکر غفرلہٗ) ناظم عمومی جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ

افکار و آراء

اسلام کا مقدّمہ کون لڑے گا۔؟

——— اداریہ روزنامہ وفاق لاہور۔ بابت ۹ فروری ۱۹۶۹ء ———

جمہوریت کے علم بردار بجا طور پر شاداں و فرحاں ہیں کہ انہیں ایوانِ اقتدار سے سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لئے باہمی مذاکرات کی دعوت موصول ہو چکی ہے اور اب ان کی جد و جہد آخری مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے۔ جو مسائل مذاکرات کا موضوع بننے والے ہیں، ان میں بالغ رائے دہی کا حق اور پارلیمانی نظام کی بحالی کے مطالبات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں تک جمہوری مجلسِ عمل کے دوسرے مطالبات کا تعلق ہے، غالب گمان یہی ہے کہ یہ مطالبات مذاکرات شروع ہونے سے پہلے ہی پورے ہو چکے ہوں گے اس لئے کہ دفاعی قوانین کی تنسیخ کے بعد بنیادی حقوق آپ سے آپ بحال ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں سیاسی نظر بند بھی رہا نہیں ہوں گے بلکہ دفاعی قوانین کے تحت ضبط شدہ بعض پریس بھی واگذار ہو جائیں گے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف سازش کے مقدمہ کا مسئلہ بھی کسی نہ کسی طرح حل ہو ہی جائے گا اور اس طرح طریقِ انتخاب اور طرزِ حکومت کے مسائل ہی باقی رہ جائیں گے جو مجوزہ راولپنڈی کانفرنس میں موضوعِ بحث بنیں گے۔ ہوا کا رُخ یہی بتاتا ہے کہ ان مسائل پر بھی مصالحت و مفاہمت کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئیگا

اس کے بعد کیا ہو گا ——؟ اس سوال کا قطعی جواب تو سردست ممکن نہیں ہے۔ البتہ اگر حالات نے کوئی پیچیدہ شکل اختیار نہ کی تو اس کے بعد انتخابی میدان میں معرکہ آرائی ہو گی۔ اب تک جن آٹھ جماعتوں نے اشتراکِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بنیادی مسائل پر شدید نوعیت کے باہمی اختلافات کے باوجود صرف اس مقصد کے لئے مشترکہ جد و جہد پر متحد رہی ہیں کہ عوام کے بنیادی حقوق بحال کرائے جا سکیں اور اس طرح ملک میں جمہوریت کا بول بالا کیا جا سکے ان جماعتوں نے الیکشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ بھی اسی بنا پر کیا تھا کہ مروجہ طریقِ انتخاب ان کے نزدیک غیر جمہوری تھا طریقِ انتخاب کی تبدیلی ——جو اب یقینی ہو چکی ہے —— کے بعد عام انتخابات کے انعقاد میں کوئی رکاوٹ نہیں رہنی چاہئے اور بعید نہیں کہ اپوزیشن کا موجودہ اتحاد۔ کچھ مزید وسعت کے ساتھ۔ صداقتی انتخاب کی حد تک برقرار ہی رہے ——

تاہم اس اتحاد کا کسی نہ کسی مرحلہ پر ختم ہونا شک و شبہ سے بالا ہے۔ اس لئے کہ اب تک اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے بعض دینی جماعتوں نے جو قیمت ادا کی ہے آئندہ کے لئے یہ قیمت ادا کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض حلقوں کی طرف سے بلا وجہ اس خوش فہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ آٹھ جماعتوں کے متفقہ مطالبات میں اسلامی نظام کے قیام

کا مطالبہ بھی شامل ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا مطالبہ شامل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی اور بالآخر جمہوری حقوق سے متعلق آٹھ نکات پر سب کو اتفاق کرنا پڑا۔ اس بحث کا یہ افسوسناک پہلو بھی مصدقہ ذرائع سے درست ثابت ہو چکا ہے کہ ڈھاکہ میں آٹھ جماعتوں کے مذاکرات میں شریک بعض جماعتوں کے نمائندوں نے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر صاف صاف اعلان کیا کہ ہم اسلام کو اپنے مطالبات میں شامل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ان کی بات مان لی گئی اور اسلام کی وکالت کرنے والے اصحاب مجبوراً یا مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ یہاں ضمناً اس حقیقت کا اظہار بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عدالت عالیہ میں ہفت روزہ "چٹان" کے مقدمہ کی پیروی سے بعض بڑے بڑے وکلاء نے اس بنا پر معذرت کر دی تھی کہ اس مقدمہ میں ختم نبوت کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے گا۔ یہ بڑے بڑے وکلاء اور ان کے سیاسی رُفقا ہی تھے جو ڈھاکہ کے مذاکرات میں "اسلام" کا نام سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔

اِس پس منظر کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا کسی طرح بھی غلط نہ ہوگا کہ اپوزیشن کا موجودہ اتحاد عام انتخابات کا مرحلہ شروع ہوتے ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ممکن ہے اپوزیشن پارٹیاں اشتراکی اور اسلامی محاذوں میں تقسیم ہو جائیں۔ لیکن جو اندیشہ ہمارے لئے سب سے زیادہ تشویش کا موجب ہے اور جس پر محب دین عناصر کو ابھی سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے۔ وہ دینی جماعتوں کی باہمی کشمکش کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات ہمارے اس اندیشے کو قبل از وقت قرار دے کر نظر انداز کر دینا ہی پسند کریں۔ لیکن ہم انتہائی افسوس اور دلی رنج کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ حالیہ عوامی جدوجہد میں بھی عوام کے سامنے اسلام کا مقدمہ پیش نہیں کیا جا سکا اور اب بھی اگر بروقت اسلام کے حق میں موثر آواز نہ اٹھائی گئی تو اس کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے۔ ہم جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کے دوران بھی دینی حلقوں کو ان مسائل کی طرف متوجہ کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے ہیں اور اب پھر پوری دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو وقت ضائع ہو چکا ہے، اسے تو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن جو وقت گذر رہا ہے اور جو وقت آنے والا ہے کم از کم اس میں تو اسلام کا مقدمہ پیش کرنے کا فرض ادا کیا جائے۔ اگر یہ کوشش ہمہ جہتی اور ہمہ گیر نہ ہوئی تو ڈر ہے کہ اسلام کا مقدمہ کمزور پڑ جائے گا اور بعید نہیں کہ اشتراکیت کے صنم خانہ کو ہمارے ہی کعبہ سے پاسبان میسر آجائیں۔ دیکھئے اسلام کا مقدمہ لڑنے کے لئے کون میدان عمل میں کودتا ہے اور یہ سعادت کس خوش نصیب کو حاصل ہوتی ہے کہ وہ دینی محاذ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے ابھی سے بھرپور جدوجہد شروع کر سکے۔ اس جدوجہد کا مرکز و محور محض انتخابی معرکہ آرائی تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اصل مسئلہ ذہنی اور فکری انقلاب کا ہے جس کی طرف توجہ دیئے بغیر جیتی ہوئی سیاسی بازی بھی شکست میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس لئے ذہنی اور فکری محاذ کو کماحقہٗ اہمیت دینا ازبس ضروری ہے۔

افکار و آراء (۲)

حضرات علماء کرام سے دردمندانہ اپیل

"اسلام دنیا میں عالمگیر امن و سلامتی کے قیام کے لئے حیات افروز پیغام ہے۔ جس میں عدل و انصاف اور انسانیت کے فروغ کے لئے رحمۃ للعالمینی نظام موجود ہے جس کی اشاعت ہر ذی شعور مسلمان پر فرض ہے۔ لیکن اصل ذمہ داری اس جماعت پر عائد ہوتی ہے جو اس سے زیادہ واقفیت رکھتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ علماء حق نے ہر دور میں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے سینہ سپر ہو کر حق کا بول بالا کیا ہے اور قریباً ہر دور میں مختلف صورتوں میں اسلام کے خلاف محاذ قائم رہے۔ لیکن جس قدر موجودہ دور میں اسلام کے خلاف شدید ترین منظم حملے شروع ہو گئے ہیں ایسے پہلے نہیں ہوا۔

ایک طرف انسانیت سوز مادی طاقتوں کے بل بوتے پر اسرائیل کی وحشیانہ جارحیت اور اس کے خطرناک عزائم مسلمانوں کی غیرت ایمانی کے لئے کھلا چیلنج ہیں۔ دوسری طرف اشتراکیت (کمیونزم) کا بے پناہ سیلاب امنڈتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ ادھر انگریز کے آہنی پنجہ سے نو آزاد مملکت خداداد پاکستان کے بنیادی نظریہ کو مسخ کرنے کے لئے مختلف انداز میں حربے استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ ملک کس مقدس نظریہ کے تحت قائم ہوا تھا اور اس عظیم ترین ملی مقصد کے لئے کس قدر قربانیاں ہوئی ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریز کی آمد سے ہی اس اہم ترین ملی مہم کے لئے حریت پسند مجاہدین اسلام (علماء حق) کی قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو بالآخر بفضلہ تعالیٰ پاکستان کی صورت میں منتج ہوا اب اس پاکیزہ نظریہ کی تکمیل میں جس قدر تاخیر ہو رہی یا کی جا رہی ہے۔ اس کے اسباب و وجوہ ظاہر ہیں

عیاں راچہ بیاں

اندریں حالات باہمی خلفشار اور بدنظمی کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اور کچھ وقت یہی اندوہناک کیفیت رہی اور حساس حضرات کی جانب سے اپنی منصبی ذمہ داری کا بروقت مناسب اور موثر اقدام نہ ہو سکا تو غیر دینی عناصر آگے بڑھ کر میدان پر قبضہ کر لیں گے، بعد میں تلافی مافات مشکل ہو گی۔ اس کے نتائج جس قدر ملت بیضاء کے لئے انتہائی خطرناک ہوں گے اس کی ذمہ داری کس پر ہو گی؟ — اس لئے تمام اسلامی حمیت رکھنے والے حلقوں سے بالعموم اور علماء دین سے بالخصوص نہایت ہی دردمندانہ استدعا (اپیل) ہے کہ خدارا۔ مصطفےٰ راوقت کی نزاکت کا خیال فرماتے ہوئے ہر قسم کے اختلافات کو ختم کر کے دین قیم

خطوط و نکات

۱۔ تدبّر قرآن کے بارے میں

"دفتر ہفتہ وار کانتی

۱۵۲۵ سوئی والان ۔دہلی ۔۶

محترم المقام زید مجدکم ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی! مجھے حال میں تفسیر تدبر قرآن کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔اس میں شبہ نہیں کہ یہ تفسیر ذوق علم رکھنے والوں کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے اس تفسیر میں نہ صرف یہ کہ ذہن و فکر کے لئے روشنی ہے بلکہ بے چین دلوں کے لئے بھی اس میں تسکین کا سامان موجود ہے۔ جزاک اللّٰہ فی الدارین ۔خدا آپ کے اوقات میں برکت عطا فرمائے کہ آپ قرآن کی یہ تفسیر جلد سے جلد مکمل فرما سکیں۔

سورۂ آل عمران سے آیت ۱۵۲ میں "ولقد عفا عنکم" کا اور آیت ۱۵۴ کے آخری الفاظ کا ترجمہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح فرمادیں۔

والسلام

خاکسار ——— محمد فاروق

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۸ء"

۲۔ تذکرہ و تبصرہ، ماہ جنوری پر تبصرے

"ابھی ابھی پرچہ ملا ہے۔طبیعت خوش ہوگئی۔بیس دن کے انتظار کی کوفت ختم ہوگئی۔تذکرہ و تبصرہ پڑھ کر دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!

اور پھر

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم

جنیدؒ و شبلیؒ و عطارؒ ہم مست

احقر نجیب صدیقی ۔سکھر

ت۔ "میثاق" کا جنوری ۱۹۶۹ء کا "تذکرہ و تبصرہ" نظر سے گذرا، پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ نے تمام سیاسی تنظیموں کو ان کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے۔ یہ زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگوانے والے حقیقت میں اپنی خودغرض تمنائیں پوری کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، مگر بظاہر عوام کے دوست بن کر چلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے سادے عوام ان کی شاطرانہ چالوں کا شکار ہو کر اپنا نقصان خود کر بیٹھتے ہیں۔ میری دلی دعا اور تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ادبی حلقوں میں ایسے افراد پیدا کرے جو حالات کو ان کے اصل روپ میں پیش کرنے سے کبھی دریغ نہ کریں۔

امید ہے آپ کے ایسے بے باک مضامین بھٹکے ہوئے افراد کے لئے سنگِ میل کا کام دیں گے۔

فقط ــــ خاکسار

ابرار احمد۔ ۱۵۲- کے "ایریا کورنگی نا کراچی"

۳۔ بریدِ فرنگ

سیلی ہال، جامعہ ریڈنگ، یو کے

۱۵۔ فروری

تازہ میثاق پرسوں مل گیا تھا۔ پچھلے اور اس پرچے کے "تذکرہ و تبصرہ" میں آپ نے پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات کی جس طرح تعبیر کی ہے وہ خاصی تشویشناک ہے۔ یہاں کے روزنامہ 'THE TIMES' سے باقاعدہ وہاں کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ تخریب، ہنگامہ اور ہلڑبازی جس حد تک پہنچ چکی ہے اس سے مجھے تو یہ خدشہ بھی ہونے لگا ہے کہ پاکستان میں ایک مرتبہ پھر (نئی) فوجی آمریت نہ مسلط ہو جائے!

حالیہ واقعات بڑی حد تک لاقانونیت اور انارکی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ ان دو ماہ کے شماروں میں حالیہ صورت حال پر "میثاق" کا موقف واضح کر چکے ہیں۔ آپ کے لئے آئندہ اس ضمن میں خاموشی ہی بہتر رہے گی۔ جیسا کہ آپ خود لکھ چکے ہیں اس پوری کشمکش (حکومت vs اپوزیشن) میں اسلام اور مذہبی اقدار کے احیاء کو دور کا بھی واسطہ نہیں، چنانچہ اس کو بار بار موضوع بحث بنانا بے کار ہے۔ کاش مولانا مودودی صاحب اور اسلام کے دوسرے خیرخواہوں کی آنکھیں اب بھی کھل جائیں۔ اور وہ صحیح خطوط پر احیائے اسلام اور اقامت دین کا کام کریں۔ ورنہ خطرہ ہے کہ آئندہ چند سالوں میں عوامی کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار نہ ہو جائے۔

دعا جو ــــــــ "انصار احمد"

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول ——— مشتمل بر

مقدمہ و تفاسیر آیۂ بسم اللہ ، سورۂ فاتحہ ، سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران

سائز $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ ، صفحات ۸۸۰

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ ۳۰ روپے

(محصول ڈاک : ڈھائی روپے)

(بتیس روپے پچاس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

(نمونہ کے صفحات مفت طلب فرمائیں)

اس کے علاوہ **تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ**

علیحدہ مطبوعہ بھی موجود ہے بذریعہ ڈاک طلب فرمانے کے لئے ۸۵ پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں ۔

بڑا سائز ۔ صفحات ۳۶ ۔ ہدیہ ۷۵ پیسے

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ 1 فون نمبر 69522

(سول ایجنٹ برائے بھارت : کتب خانہ الفرقان ، کچہری روڈ ۔۔ لکھنؤ)

Regd. No: L. 7360
Monthly "MEESAAQ" Lahore
Vol. 16 | MARCH 1969 | No. 3

سلسلۂ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام

از قلم : ——— اسرار احمد

مع تائید و توثیق بعنوان

,, فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر ،،

از قلم :- پروفیسر یوسف سلیم چشتی

,, دونوں مقالے ماہ نامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے - دونوں فکر انگیز ہیں - اور ایک طرف جوش و اخلاص ، دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں - مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج ، دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے - تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں ، رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔،،

مولانا عبدالماجد دریا بادی

صدق جدید - ۷ فروری ۱۹۶۹ء

سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۵۶ - طباعت آفسٹ , قیمت ایک روپیہ

شائع کردہ —

دار الاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور

کوئز روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور-۱ (فون 69522)

پبلشر : محی الدین ، طابع : محمد طفیل سالک نقوش پریس اردو بازار لاہور